بھٹو

(انقلاب سے احتساب تک)

طاہر انجم

بھٹو
(انقلاب سے احتساب تک)

طاہر انجم

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور فون: 7352332-7232336

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	.....	بھٹو.....انقلاب سے احتساب تک
مصنف	.....	طاہر انجم
ناشر	.....	گلفراز احمد علم وعرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	.....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ	.....	ظفر اقبال
پروف ریڈنگ	.....	روبینہ طاہر
سن اشاعت	.....	جون 2007ء
قیمت	.....	-/150روپے

علم وعرفان پبلشرز

34۔اردو بازار، لاہور فون:7352332-7232336

سیونتھ سکائی پبلیکیشنز

غزنی سٹریٹ الحمد مارکیٹ 40۔اردو بازار، لاہور

فون:7223584، موبائل0300-4125230

انتساب!

محترمہ بے نظیر بھٹو

اور

اُن تمام لوگوں کے نام

جو آج بھی بھٹو سے محبت کرتے ہیں۔

www.bhutto.org

www.bhutto.org

اے غمزدوں کو خوش کر دینے والے اللہ
میں تیری ہی رحمت کا طلبگار رہوں

اے اللہ میں کمزور ہوں تو قوتوں والا ہے، میں عاجز ہوں تو بے نیاز ہے، میں منگتا ہوں تو داتا ہے، میں مجرم ہوں تو شہنشاہ ہے، تجھے تیری شان رحیمی و کریمی کا واسطہ، سردار انبیا، امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے صدقے مجھ پر کرم فرما اور میرے صغیرہ و کبیرہ گناہ معاف کر دے، کیونکہ میں کسی امتحان اور آزمائش کے قابل نہیں۔ اے اللہ تو معاف کرنے والا ہے۔ معاف کرنے کو پسند کرتا ہے۔ معاف کرنا تیری ادا ہے تو مجھے بھی معاف کر دے۔ میری حاجتیں پوری کر دے کیونکہ تو ہی حاجت روا ہے۔ میری مشکلیں آسان کر دے کیونکہ تو ہی مشکل کشا ہے۔ تو ہی میرا آقا و مولا ہے۔ تو ہی ارض و سما کا ملک ہے اور تو ہی وسعتیں دینے والا ہے۔ اے اللہ میں کچھ نہیں، میرا کچھ نہیں، تو ہی سب کچھ ہے، تیرا ہی سب کچھ ہے۔

www.bhutto.org

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین		صفحہ
-1	بھٹو کا مشن ہمیشہ جاری رہے گا	نصرت بھٹو	9
-2	وہ فرشتہ نہیں سیاست دان تھا	خالد منہاس	10
-3	مجھے کچھ کہنا ہے	طاہر انجم	12
-4	ایک عظیم انسان	نادر حسین	18
-5	ذوالفقار علی بھٹو.....جدت پسند مسلم رہنما	بے نظیر بھٹو	22
-6	ذوالفقار علی بھٹو شہید		27
-7	ملکی سیاست میں بھٹو خاندان کا کردار		29
-8	ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست میں دلچسپی		34
-9	ذوالفقار علی بھٹو کی ابتدائی سیاسی زندگی		37
-10	پیپلز پارٹی کا قیام اور بھٹو کا انداز سیاست		44
-11	بھٹو عوام کی ضرورتوں کو سمجھتے تھے	بے نظیر بھٹو سے خصوصی انٹرویو	50
-12	بھٹو کا اندازِ حکومت		82
-13	بھٹو کا قتل		89
-14	الذوالفقار کا قیام اور ضیاء الحق کے منصوبے		102
15	بے نظیر کا خطاب اور جمہوری تقاضے		110

www.bhutto.org

-16	پانچ جولائی محض ایک تاریخ نہیں	112
-17	فوج کے ذہن پر اب بھی بھٹو کا خوف؟	116
-18	بھٹو کا عدالتی قتل	119
-19	ایک عہد ساز شخصیت	121
-20	پیپلز پارٹی انقلاب سے احتساب تک	124
-21	قائد عوام کی قبر سے آزادی اور ترقی کا لازوال پیغام	127
-22	دورِ جدید کی عظیم مسلم شخصیت	131
-23	حریت کا عظیم رہنما	136
-24	بھٹو ہر دلعزیز رہنما	141
-25	شہید ذوالفقار علی بھٹو سچو رین لیڈر	144
-26	بھٹو اور حالاتِ حاضرہ	146
-27	بھٹو کل بھی زندہ تھا آج بھی زندہ ہے	149
-28	ضیاء کے پہلے قیدی... بھٹو	153
-29	سیاسی انتقام	159
-30	تضادات سے بھرپور انسان	163
-31	کیوں نہ فوجیوں کو آزمالیں	171
-32	1970ء کے انتخابات اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کا قیام	174
-33	وہ چپ لگی ہے!	177
-34	یاالٰہی مرگِ یوسف کی خبر سچی نہ ہو	179
-35	بھٹو کی پھانسی کا دن..... آپ کی یادیں	183
-36	سائیں بابا کا مزار	190

www.bhutto.org

بھٹو کا مشن ہمیشہ جاری رہے گا

مجھے ذوالفقار علی بھٹو شہید کی بیگم ہونے پر فخر ہے کیوں کہ میرے شوہر نے پاکستان سے آمریت کے خاتمے اور جمہوری اقدار کے فروغ اور غریب عوام کے حقوق کے لیے دن رات جدوجہد کی، جس میں، میں خود ذوالفقار علی بھٹو کے شانہ بشانہ رہی اور میں نے ضیاالحق کی طویل بدترین آمریت کے خلاف بے شمار مصائب و مشکلات کا سامنا کیا، قید و بند کی سختیاں برداشت کیں، لاٹھیاں کھائیں، شوہر اور دو جوان بیٹوں کی جدائی جیسے پہاڑ کا سامنا تک کیا، لیکن اس کے باوجود میں نے اپنے شوہر ذوالفقار علی بھٹو شہید کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پاکستان کے عوام کو آمریت کے ظلم کے سامنے تنہا نہیں چھوڑا، مجھے اپنی بیٹی بے نظیر بھٹو کی اس جدوجہد پر فخر ہے جس کی ابتدا میرے شوہر شہید ذوالفقار علی بھٹو نے کی تھی اور اپنے داماد آصف علی زرداری، جنھوں نے آمریت کے خلاف طویل قید کاٹی اور ظلم و تشدد برداشت کر کے اپنے آپ کو شہید بھٹو کا سچا سپاہی ثابت کر دکھایا۔

نصرت بھٹو

www.bhutto.org

وہ فرشتہ نہیں سیاست دان تھا

بھٹو کی زندگی پر اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں ملکی اور غیر ملکی مصنف شامل ہیں۔ ان کتابوں میں ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور کتاب طاہر انجم نے لکھی ہے جس کا عنوان ''بھٹو انقلاب سے احتساب تک'' ہے۔ طاہر انجم ایک محنتی نوجوان صحافی ہے اور ہمیشہ کچھ نیا کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس سے قبل اس نے تین کتابیں ''یہ ہیں ہمارے حکمران''، ''پاکستان تباہی کے دہانے پر'' اور ''بھٹو کا جان نشین'' لکھی ہیں جسے قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔ اس کی تازہ کتاب اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں ایک ایسی شخصیت کے کردار پر بحث کی گئی ہے جس کے بارے میں اس کے دشمن بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ایک سیاست دان تھا، ساتھ ہی دوسرا گروہ یہ آوازہ کستا ہے کہ وہ شاطر سیاست دان تھا لیکن اس بات کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ واقعتاً ایک سیاست دان تھا جس نے پاکستان کو آگے بڑھانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔

تمام تر کوشش کے باوجود پاکستان کی سیاست میں سے بھٹو فیکٹر کو نہیں نکالا جاسکا۔ بلکہ ماضی قریب تک تو سیاست بھٹو اور انٹی بھٹو اصول کے تحت ہوتی تھی۔ یہ اس کا کمال تھا کہ اس نے پسے اور مظلوم عوام کو زبان عطا کی۔ ملک کو فلاح ریاست بنانے کے لیے پہلی بار روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کیا اور یہ نعرہ لوگ اب بھی لگا رہے ہیں۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ اقتدار میں آنے کے بعد ان کا یہ نعرہ سچ ثابت ہو سکا یا نہیں لیکن انھوں نے عوام کو یہ باور کرادیا کہ یہ ریاست کا فرض ہے کہ وہ انسان کی بنیادی ضروریات کا خیال رکھے۔ تاریخ کے ورق اُلٹ کر دیکھیں تو ہم بخوبی دیکھ سکتے ہیں کہ اس وقت کے بونے

www.bhutto.org

سیاست دانوں میں بھٹو کا قد سب سے بلند تھا۔ ان کے ذاتی کردار پر تو انگلی اٹھائی جاسکتی ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی کوشش سے ہی پہلی بار ملک کا متفقہ آئین تیار ہوا۔ بھارت کا مقابلہ اور خطے میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے ایٹمی ٹیکنالوجی کے حصول کی کوشش کی گئی۔ امریکا کی حاشیہ برداری کو ختم کرنے کے لیے اقدامات کیے گئے۔ امت مسلمہ کو متحد کرنے کے لیے شاہ فیصل کے ساتھ مل کر انھوں نے او آئی سی کی بنیاد رکھی اور اس کا دوسرا اجلاس لاہور شہر میں منعقد کیا۔

بھٹو کے بارے میں برملا یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ فرشتہ نہیں بلکہ سیاست دان تھا۔ اس نے سیاسی میدان میں کئی غلطیاں بھی کی ہیں لیکن اس کے باوجود اس کے نظریے اور فکر کی طاقت میں کمی نہیں آئی۔ آج بھی لوگ بھٹو کے نعرے اور نظریے کے ساتھ کھڑے ہیں اور وہ واحد جماعت ہے جس کی جڑیں چاروں صوبوں میں بہت مضبوط ہیں۔ گذشتہ انتخابات میں تمام تر کوشش کے باجود اس کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کو سب سے زیادہ ووٹ ملے تھے۔

میں طاہر انجم کو یہ کتاب لکھنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ اس نے بھٹو کی شخصیت کے کئی اہم پہلوؤں کو ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے۔

خالد منہاس

جوائنٹ ایڈیٹر

روزنامہ ''اوصاف'' لاہور

www.bhutto.org

مجھے کچھ کہنا ہے

قارئین کرام! میری نئی کتاب ''بھٹو..... انقلاب سے احتساب تک'' آپ کے ہاتھ میں ہے اور مجھے امید ہے کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی آپ میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے، میں آج جہاں تک بھی پہنچا ہوں یا پہنچ سکا ہوں وہ سب آپ لوگوں کی بدولت ہے..... میں جانتا ہوں کہ بھٹو صاحب کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا جس میں ملکی اور غیر ملکی سبھی مصنف شامل ہیں لیکن اس کتاب میں محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے انٹرویو کے علاوہ بھٹو صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے کتاب پڑھنے کے بعد اپنی رائے سے ضرور نوازیئے گا۔

جنوبی ایشیا کے ممالک کو 1970ء کی دہائی میں ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں ایک ایسا لیڈر ملا جو خطے میں نہ صرف ایک نئی طاقت ابھارنے کی صلاحیت رکھتا تھا بلکہ اس کی آنکھ روس اور امریکا کا زوال بھی دیکھ چکی تھی اور اس کی کوشش تھی کہ 1980ء کی دہائی ختم ہونے سے قبل جنوبی ایشیا کے ممالک کو مضبوط بندھن میں باندھ کر ایک ایسی طاقت پیدا کردی جائے جو علاقے سے نہ صرف غربت و افلاس مٹا دے بلکہ اس خطے میں رہنے والوں کو دیرپا امن بھی فراہم کرے اور خوشحالی کا دور رواں ہو۔ یہ وہ خواب تھا جو ذوالفقار علی بھٹو نے دیکھا لیکن ان کے منصوبے ایران کے فرمانروا شہنشاہ رضا شاہ پہلوی کے توسط سے امریکی سی آئی اے تک پہنچ گئے اور پھر ایک ایسی سازش تیار کی گئی اور ایک ایسا جال بچھایا گیا جس میں ذوالفقار علی بھٹو انا کا شکار ہو کر پھنستے ہی چلے گئے۔ حالاں کہ یہ وہی بھٹو تھے جنھیں ایوب خاں کے خلاف تحریک چلانے کے لیے امریکا کی تائید و حمایت حاصل رہی اور اس طرح 1960ء کی دہائی میں سیاست کے افق پر نمودار ہونے والا یہ روشن ستارہ دیکھتے ہی

www.bhutto.org

دیکھتے فضاؤں میں تحلیل ہو گیا اور جنوبی ایشیاء میں ایک نئی دنیا کے قیام کا خواب ادھورا رہ گیا۔

بھٹو خاندان کی تاریخ کوئی زیادہ پرانی نہیں، یہی کوئی سو ایک سال قبل بھٹو خاندان نے سیاست میں قدم رکھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ خاندان برصغیر کے بڑے سیاسی خاندانوں کی فہرست میں شامل ہو گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے آباؤ اجداد بھارت کے ریگستانی علاقوں میں رہتے تھے اور جب وہاں پانی کی قلت پیدا ہوئی تو وہ لوگ ہجرت کر کے دریائے سندھ کے کنارے پر آباد ہو گئے۔ یہ وہ دور تھا جب زیادہ تر آبادیاں دریاؤں کے کناروں پر قائم ہوتی تھیں اور وادیٔ سندھ میں پانچ ہزار سال قبل کی تہذیب کے آثار کی موجودگی کا سبب یہاں کی زرخیز زمین اور پانی تھا۔ موہنجوڈارو اور ہڑپہ کی قدیم تہذیبوں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ جوں جوں دریاؤں کے رُخ تبدیل ہوتے رہتے تھے ویسے ہی ویسے لوگ بھی وہاں سے ہجرت کرتے رہتے تھے کیوں کہ ان ایام میں زیادہ تر لوگوں کا ذریعہ معاش زراعت اور تجارت تھا۔ بھٹو خاندان کے جد امجد Sheto دراصل ہندو راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور 17 ویں صدی میں مغل حکمرانوں نے جب برصغیر پر چڑھائی کی تو علاقے میں سکونت پذیر زیادہ تر آبادی ان کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر دائرہ اسلام میں آ گئی۔ بھٹو خاندان بھی اسی دور میں مشرف بہ اسلام ہوا اور انھیں اپنے علاقے کی سطح پر عزت و احترام سے دیکھا جانے لگا۔ سندھ میں آباد ہونے کے بعد بھٹو خاندان کو تالپور، کلہوڑا اور کھوڑو خاندان سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ ان کی کسی زمانے میں دوستی نے دشمنی کا رُخ اختیار کیا اور کبھی مصلحتوں کی بنا پر دشمنی کو ترک کر کے دوستی کی گئی۔ Sheto کو مغل حکمرانوں نے ان کی خدمات کے اعتراف میں خان کا لقب دیا۔ آج کے مہذب اور ترقی یافتہ دور میں بھی اگر کسی علاقے میں دو ''معزز'' افراد پیدا ہو جائیں تو وہ ایک دوسرے کو برداشت نہیں کرتے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا وہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے کہ خدا کی پناہ! یہی حال 1800ء کے اوائل میں اس وقت ہوا جب بھٹو خاندان کا تالپور اور کلہوڑا خاندان کے ساتھ سیاسی معاملات پر جھگڑا شروع ہو گیا۔ یہ وہ دور تھا جب مغلوں کا امور مملکت پر کنٹرول کمزور ہوتا جا رہا تھا اور ان کے زیر کنٹرول علاقوں میں شورشیں عام تھیں اور جس کا جی چاہتا مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے امور مملکت اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ ان حالات میں انگریزوں نے مغل حکمرانوں کی جڑیں کاٹنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ان کی کوشش یہ رہی کہ دارالسلطنت سے دور دراز علاقوں میں ساز باز کر کے قبضہ کیا جائے تاکہ مغلوں کو وہاں

www.bhutto.org

سے بھیج کر اپنے علاقے واپس لینے میں سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ Sheto Khan نے مغل حکمرانوں کی کمزوری کو بھانپ کر دریائے سندھ کے ساحلی علاقوں میں اپنے قبیلے کو مضبوط کرنا شروع کر دیا اور ان کے پوتے پیر بخش خاں بھٹو نے انگریزوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو پروان چڑھایا جس کے بدلے میں انھیں سیاسی لحاظ سے فوائد حاصل ہوئے۔ سندھ کے سیاسی وڈیرے اگر اپنے اختلافات کو پس پشت ڈال کر انگریزوں کے خلاف ڈٹ جاتے تو کم از کم وادی سندھ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس قدر آسانی سے غلبہ حاصل نہ ہوتا جس قدر سرعت کے ساتھ انھوں نے سندھ ختم کیا۔ تالپور خاندان نے خصوصی طور پر سندھ کو انگریزوں کے حوالے کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا کیوں کہ تالپوروں نے ایک معاہدے کے تحت انگریزوں کو 1838ء میں اپنی فوج حیدر آباد میں رکھنے کی اجازت دی جس کے 7 سال کے اندر انگریز فوج نے سندھ پر قبضہ کر لیا اور ملکہ برطانیہ کے نامزد کردہ گورنر سر چارلس نے کراچی میں بیٹھ کر سندھ پر حکومت کی۔ انھیں اس زمانے میں سندھ کے تمام وڈیروں کا تعاون میسر رہا اور پیر بخش خاں بھٹو کے صاحبزادے ڈوڈو خاں کو اس دور میں خصوصی عزت عطا کی گئی لیکن ان کے پوتے غلام مرتضیٰ بھٹو اس دور میں ایک انگریز مجسٹریٹ کی بیوی پر عاشق ہو گئے اور وہ خاتون بھی غلام مرتضیٰ بھٹو کو پسند کرنے لگی۔ یہاں سے بھٹو خاندان کی پہلی آزمائش شروع ہوئی کیوں کہ غلام مرتضیٰ بھٹو ''میم صاحبہ'' کے ساتھ عشق لڑاتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیے گئے۔ چوں کہ انگریز مجسٹریٹ کے پاس اختیارات کی کمی نہ تھی اس لیے انھوں نے بھٹو خاندان کے چشم و چراغ غلام مرتضیٰ بھٹو کو مقدمات میں الجھا دیا۔ تالپور اور کاہوڑا خاندان سے تعلق رکھنے والے وڈیرے اس صورت حالات سے اچھی طرح آگاہ تھے اس لیے انھوں نے بھٹو خاندان کو زیر عتاب دیکھ کر علاقے میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانا شروع کر دیا اور انہی سازشوں کے نتیجے میں غلام مرتضیٰ بھٹو کے والد خدا بخش بھٹو پراسرار انداز میں ہلاک ہو گئے۔ بھٹو خاندان کے افراد نے جب دیکھا کہ انگریز سرکار نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے تو انھوں نے غلام مرتضیٰ بھٹو کو مشورہ دیا کہ وہ فرار ہو جائیں کیوں کہ انگریزوں کے ساتھ مقدمے بازی میں خاندان کی سیاسی طاقت ختم ہو کر رہ گئی تھی جب کہ مالی لحاظ سے غلام مرتضیٰ بھٹو اس پوزیشن میں نہ تھے کہ انگریزوں کے قوانین کا عدالت میں سامنا کرتے اس لیے وہ فرار ہو کر افغانستان چلے گئے۔ والئی افغانستان امیر عبدالرحمٰن نے مرتضیٰ کی کافی مدد کی اور انھیں سونے

www.bhutto.org

کی شکل میں مالی اعانت فراہم کی، لیکن جس کشتی میں بیٹھ کر غلام مرتضیٰ بھٹو سندھ جا رہے تھے وہ راستے میں الٹ گئی اور سونا ضائع ہوگیا۔ مگر اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح کراچی پہنچ گئے جہاں انھوں نے محنت مزدوری کر کے گزر اوقات شروع کر دی۔ غلام مرتضیٰ بھٹو کو یقین تھا کہ اگر کسی نہ کسی طرح ان کی انگریز کمشنر Sir Ivon James تک رسائی ہو جائے تو ان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز مجسٹریٹ نے اپنے اثر و رسوخ سے عدالتی فیصلے کو اپنے حق میں کر دا لیا تھا۔ چنانچہ غلام مرتضیٰ بھٹو نے سکھ کا روپ دھار کر انگریز کمشنر کے گھر میں ملازمت اختیار کی اور ایک روز اچانک انھوں نے انگریز کمشنر کے سامنے آ کر اپنی کہانی بیان کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ جناب والا میں انصاف چاہتا ہوں ... میرے ساتھ انصاف کیا جائے کیوں کہ ایک انگریز مجسٹریٹ نے مجھے محض اس لیے انتقام کا نشانہ بنایا ہے کہ اس کی بیوی کے ساتھ میری شناسائی تھی۔ غلام مرتضیٰ بھٹو کی زبانی سچ سُن کر انگریز کمشنر نے حکم دیا کہ غلام مرتضیٰ کے ساتھ انصاف کیا جائے، لہٰذا Fair Trial کے بعد غلام مرتضیٰ بھٹو مقدمہ جیت گئے۔ ان کے وکیل موتی رام اڈوانی تھے اور اس طرح بھٹو خاندان کو ایک کڑی آزمائش کے بعد سکھ نصیب ہوا۔ غلام مرتضیٰ بھٹو کی انگریز مجسٹریٹ کے ساتھ صلح ہوگئی تو انھیں 1899ء میں وہ تمام جائیداد واپس مل گئی جو ان کے فرار ہونے کے بعد انگریز بہادر نے بحق سرکار ضبط کر لی تھی۔ غلام مرتضیٰ بھٹو کو اچھی طرح علم تھا کہ ان کی مفروری کے دوران سندھ کے وڈیروں، مزارعوں اور دوسرے افراد نے ان کے خاندان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا لیکن سیاسی مصلحتوں کے تحت انھوں نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ غلام مرتضیٰ بھٹو ذوالفقار علی بھٹو کے دادا تھے اور ان میں سیاسی تدبر بے پناہ تھا۔ ان کی اسی خصوصیت کے باعث سندھ کے وڈیرے ان کے جانی دشمن تھے۔ بھٹو خاندان سے باہر سندھ کے وڈیرے اچھی طرح جانتے تھے تاکہ غلام مرتضیٰ بھٹو میں سندھ کا ایک بڑا سیاستدان بننے کی تمام خصوصیات موجود ہیں اس لیے ایک سازش کے تحت انھیں زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا اور بھٹو خاندان کو کبھی پتا نہ چل سکا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا اور کس نے مرتضیٰ کو زہر دیا۔ غلام مرتضیٰ بھٹو کی ناگہانی ہلاکت کے بعد فوری طور پر یہ مسئلہ درپیش آیا کہ ان کے بچوں اور دیگر اہل خانہ کی سرپرستی کون کرے گا کیوں کہ شاہ نواز اور علی گوہر خاں (سرپرستی کے لیے) ابھی کمسن تھے۔ سندھ کے انگریز افسران نے صورت حالات کو محسوس کرتے ہوئے وہ ہر ممکن اقدام کیا جس سے شاہ نواز اور گوہر خاں سازشوں سے

www.bhutto.org

محفوظ رہ سکیں۔ بھٹو خاندان کے بڑوں میں سے الٰہی بخش خاں بھٹو نے دونوں بچوں کی سرپرستی کا بیڑہ اٹھایا لیکن الٰہی بخش جاں بھٹو بھی زیادہ عرصہ حیات نہ رہ سکے اور ایک روز وہ بھی پراسرار طور پر اپنے گھر کے باتھ روم میں فوت ہوگئے۔ شاہ نواز جو قدرے جوان ہو چکے تھے اس طرح نہ صرف اپنے اہل خانہ بلکہ الٰہی بخش خاں بھٹو کے پسماندگان کے بھی سرپرست بن گئے اور یہاں سے صحیح معنوں میں بھٹو خاندان کی برتری کا دور شروع ہوا کیوں کہ شاہ نواز نے غیر ضروری طور پر سیاسی دشمنوں میں الجھنے کے بجائے پیر پگاڑو، تالپور، بگتی، جتوئی، رئیسانی، بجارانی اور بلیدگانی گھرانوں کے ساتھ تعلقات قائم کیے۔ شاہ نواز نے آہستہ آہستہ نہ صرف لاڑکانہ بلکہ اردگرد کے علاقوں میں بھی اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا شروع کر دیا۔ علاقے کے لوگوں کو درپیش مسائل کو بڑے غور سے سنتے اور ان سے جس قدر ممکن ہو پاتا دوسروں کی مدد کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ کے اندرونی علاقوں میں ان کی شہرت میں خاصہ اضافہ ہوا اور 1920ء میں صورت حالات یہ تھی کہ وہ امپیریل قانون ساز اسمبلی کا الیکشن لڑنے کی پوزیشن میں آ گئے۔ دراصل 1909ء کی منٹو مارلے اصلاحات کے بعد سندھ کو جب تین مزید نشستیں ملیں تو شاہ نواز نے جی ایم برگھانی کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کرلیا جنھیں وزیر اعلیٰ شیخ صادق علی نے 1909ء میں انڈین کونسل کا رکن بنوایا تھا۔ شاہ نواز نے 1920ء میں جی ایم برگھانی کو شکست دی اور اس کے 50 برس بعد ان کا صاحبزادہ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کا صدر بنا۔ شاہ نواز بھٹو کی مجموعی طور پر زندگی بہتر گزری۔ ان کا ایک بیٹا سکندر 7 برس کی عمر میں فوت ہوگیا جب کہ ذوالفقار علی بھٹو ایک ہندو خاتون لکھی بائی کے بطن سے پیدا ہوئے جس نے اسلام قبول کر کے شاہ نواز سے 1925ء میں شادی کی تھی۔ لکھی بائی کا اسلامی نام خورشید رکھا گیا۔ شاہ نواز مرحوم کے لیے لکھی بائی کے ساتھ شادی کرنا کوئی آسان فیصلہ نہ تھا کیوں کہ وہ ایک ہندو عورت تھیں اور خاندان کے بزرگ ان کے اس اقدام سے قطعاً خوش نہ تھے اس لیے مجبوراً شاہ نواز نے شادی کے لیے خان آف قلات کی کوئٹہ میں واقع رہائش کا انتخاب کیا۔ لکھی بائی کے بطن سے منا، بے نظیر اور ذوالفقار علی بھٹو پیدا ہوئے۔ بھٹو کو اپنی بہن بے نظیر سے بے انتہا محبت تھی لیکن وہ کم سنی کی حدود کو پار نہ کرسکیں اور 14 سال کی عمر میں فوت ہوگئیں۔ اپنی بہن سے محبت کے اظہار کے طور پر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی ایک بیٹی کا نام بے نظیر رکھا جو دو مرتبہ پاکستان کی وزیر اعظم بنیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ لکھی بائی (خورشید) نے متعدد ہندو

www.bhutto.org

جوتشیوں سے ان کی قسمت کا حال معلوم کیا اور تقریباً تمام جوتشیوں نے انھیں خوشخبری سنائی کہ تمہارا بچہ 50 برس کی عمر تک دنیا میں نام پیدا کر چکا ہوگا، لیکن کسی جوتشی نے بھٹو کی زندگی کے آخری ایام کے بارے میں لب نہ کھولا جس سے لگتا ہے کہ اپنے علم کے زور سے انھیں 1928ء میں بھٹو کی پیدائش کے وقت ہی اندازہ تھا کہ یہ بچہ عروج حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ایک خوفناک انجام سے بھی دوچار ہوگا۔

طاہر انجم
0321-4848560
t_anjum07@yahoo.com

۞

www.bhutto.org

ایک عظیم انسان

طاہر انجم ایک محنتی صحافی ہیں اور ہمیشہ کچھ نیا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اس سے قبل ان کی تین کتابیں ''یہ ہیں ہمارے حکمران''، ''پاکستان تباہی کے دہانے پر'' اور ''بھٹو کا جانشین'' شائع ہو چکی ہیں اور اب ''بھٹو، انقلاب سے احتساب تک'' لکھی ہے بھٹو کی زندگی پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جس میں بھٹو کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر طاہر انجم نے روشنی ڈالی ہے۔

بھٹو ایک ایسے کامیاب اور دلیر سیاستدان تھے کہ اپنے تو اپنے انٹرنیشنل سطح پر بھی لوگ انہیں بابِ سیاست کے نام سے آج بھی یاد کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کے کارنامے کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ اپنی 51 سالہ زندگی میں انھوں نے پاکستان کو دنیا کے نقشے پر ابھارا۔ ذوالفقار علی بھٹو ایک ایسا عظیم انسان جس کے قدموں کی چاپ سن کر اس وقت کے حکمرانوں اور سیاستدانوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ سرمایہ داروں، جاگیرداروں، وڈیروں اور سرداروں کے ظلم کے خلاف اس نے غریب عوام کا دست راستہ بننا پسند کیا۔ ان کی دلیرانہ اور جرأتمندانہ صلاحیتوں نے انھیں ایک عام آدمی سے کروڑوں پاکستانی عوام کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا۔ انھوں نے اپنی ذات کے لیے تو کچھ نہ کیا لیکن انھوں نے اپنی قابلیت اور جذبہ حب الوطنی کے بل بوتے پر پاکستان کو اس قابل بنا دیا کہ بڑی سے بڑی طاقت بھی پاکستان کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکے گی۔ یہ اسی عظیم انسان کی محنت کا صلہ کہ آج پاکستان دنیا کے 54 مسلم ممالک میں ایٹمی ٹیکنالوجی کے حوالے سے سرفہرست ہے۔ آج بھی جو لوگ ان کی قابلیت کے قائل ہیں، اس کی عظمت کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے سے مجھے آج بھی یاد ہے

www.bhutto.org

کہ کچھ عرصہ قبل صدرِ پاکستان جنرل پرویز مشرف صاحب نے اپنی ایک تقریر کے دوران اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ بے شک آج ہم ایٹمی طاقت رکھتے ہیں، ہمارے پاس اتنی صلاحیت ہے کہ دشمن کو ناکوں چنے چبوا سکتے ہیں لیکن اس ملک کو ایٹمی طاقت بنانے کا سہرہ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کے سر ہے۔ ڈاکٹر قدیر کو امریکا کے خونی پنجے سے بچا کر پاکستان لانا اسی عظیم انسان کا کام ہے۔ ان کے اور آج کے دور کے تعصب پسند اور منافق بونے قد کے سیاستدانوں میں ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کا قد ان کی خدمات کے حوالے سے آج بھی اونچا ہے اور جب تک پاکستان رہے گا ان کا قد اور نام ہمیشہ اونچا رہے گا۔

ایٹمی ٹیکنالوجی کے حوالے سے ذوالفقار علی بھٹو کا یہ کارنامہ کسی تعارف کا محتاج نہیں، انھوں نے ایسے ایسے کام کیے جو آج تک کوئی نہ کرسکا۔ 1974ء میں مسلمانوں کے خلافت نفرت اور تعصب پھیلانے والے اور آقا دو جہاں حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی نہ ماننے والے احمدیوں کو قیامت تک کے لیے غیر مسلم قرار دے کر پاکستان کی تاریخ میں ایک ناقابل فراموش کارنامہ سرانجام دیا۔ انہوں نے اس ملک کو ایک متفقہ آئین دیا جو آج تک قائم ہے۔ جب کسی ملک میں فرعونیت، ظلم، بے روزگاری، قتل و غارت، ڈاکا زنی اور غربت حد سے بڑھ جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی موسیٰ بھیجتا ہے۔ آج پھر اس ملک کو موسیٰ جیسے بھٹو کی ضرورت ہے۔ ایسے انسان کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں جو انسان کو انسان سمجھتے ہیں۔

وہ ایسا شخص جس نے ساری دنیا میں زلزلے برپا کر رکھے۔ جس نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی چار، ساڑھے چار لاکھ افواج کے چیف آف سٹاف اور ملک کے سینکڑوں سیاست دانوں پر خوف و ہراس طاری کیے رکھا۔ جو کال کوٹھری میں بند ہونے کے باوجود بھی ان لوگوں کے اردگرد چھلاوے کی طرح دندناتا پھرتا۔ جس کا خوف ان پر ایسے سوار تھا جیسے دھڑ پر سر سوار ہو۔ یہ لوگ ہر وقت یہی دعا مانگتے ہیں کہ بھٹو کو سزائے موت ہو جائے اس وقت کی سب سے بڑی جماعت، جماعتِ اسلامی (جو عرصہ ڈیڑھ سال سے برسرِ اقتدار ہے) نے اسے بدنام کرنے کے لیے شرمناک حربے استعمال کیے۔ لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ وہ بھٹو کو سزائے موت دینے میں مصروف تھے لیکن میرا دعویٰ ہے کہ بھٹو کو سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔ بھٹو کو سزائے موت دینا کیا آسان بات ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے بھٹو زندہ ہے بھٹو مر نہیں سکتا۔

www.bhutto.org

1974ء میں لاہور میں منعقد پہلی اسلامی کانفرنس جو لاہور میں ہوئی اس کا سارا کریڈٹ بھٹو کی شخصیت کو جاتا ہے۔ جس میں دنیا بھر کے تمام مسلم ممالک کے سربراہان نے شرکت کی۔ مرحوم شاہ فیصل نے پاکستان میں اسلامک ورلڈ بنک بنانے کا مشورہ دیا اور عربو ں کی تمام دولت اس بنک میں منتقل کرنے پر غور کیا گیا۔ مگر دنیا کے ٹھیکیدار سپر پاور ممالک کو یہ بات گوارہ نہ تھی چنانچہ ان ممالک نے سب سے پہلے شاہ فیصل کو ان کے بھتیجے کے ہاتھوں شہید کروایا۔ پھر ان کا نارگٹ بھٹو بنا۔ حکومتیں گرانا اور بنانا امریکا اور اس کے اتحادیو ں کے لیے کوئی مشکل کام نہ ہے۔ چنانچہ انھوں نے بھٹو کی حکومت کو گرا کر ملک کی باگ دوڑ ضیاء الحق کے ہاتھوں میں دے دی اور بھٹو کو ایک جھوٹے قتل کے کیس میں 4/اپریل 1979ء کو تختہ دار پر لٹکوا دیا۔

1971ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران، مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے جنرل نیازی کی وجہ سے علیحدہ ہوگیا۔ اس جنگ میں بھارت نے پاکستان کے 93,000 فوجیوں کو قیدی بنا لیا۔ آفرین ہے بھٹو کی ذات پر کہ اس نے اس وقت کی وزیراعظم اندرہ گاندھی سے صرف ایک ٹیبل ٹاک پر نہ صرف 93,000 ہزار قیدیوں کو چھڑایا بلکہ شملہ معاہدہ پر بھی دستخط کیے گئے اور یہ بات طے پائی کہ کشمیر کا مسئلہ خوش اسلوبی سے طے پایا جائے گا۔ اگر آج وہ شخص زندہ ہوتا تو کوئی شک نہیں کہ آج کشمیر آزاد ہوتا۔ انھوں نے 28 نومبر کو کراچی میں کینڈا کے تعاون سے پاکستان کے پہلا ایٹمی ری ایکٹر کا افتتاح کیا جو کہ پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا ری ایکٹر ہے۔ دوسرے ممالک سے کاروبار کرنے کے لیے انہوں نے پورٹ قاسم کا سنگ بنیاد رکھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے غریب عوام کو ساتھ لے کر چلنے کے لیے اپنی ایک پارٹی کی بنیاد رکھی جسے آج لوگ ''پاکستان پیپلز پارٹی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ پاکستان کی سب سے بڑی بااثر جماعت مانی جاتی ہے۔ اس کا ایک ہی منشور ہے جو بھٹو صاحب نے دیا وہ ہے روٹی کپڑا اور مکان۔ ان کی وفات کے بعد ان کی ہونہار اور ذہین بیٹی محترمہ بےنظیر بھٹو اس مشن کو لے کر طاغوتی طاقتوں سے ٹکراتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہیں۔ پارٹی کی چیئر پرسن ہونے کے ناطے انہوں نے کبھی بھی اپنے باپ کی بنائی ہوئی پارٹی میں اختلاف پیدا نہ ہونے دیا۔ بھٹو آج بھی کروڑوں دلوں کی دھڑکن ہے وہ مرکر بھی زندہ ہے

www.bhutto.org

اور لوگ آج بھی جیئے بھٹو کے نعرے لگاتے ہوئے نہیں تھکتے۔

سچ تو یہ ہے کہ:

''قائداعظم کے بعد اگر کوئی مخلص، نڈر اور بے باک لیڈر اس ملک کے لیے آیا تو تھا شہید ذوالفقار علی بھٹو۔''

میں طاہر انجم کے لیے دُعا گو ہوں کہ اللہ انہیں ہمیشہ خوش رکھے کیوں کہ وہ ہمیشہ دوسروں کو خوش کرنے میں لگا رہتا ہے بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو محبتیں بانٹتے ہیں انہی میں ایک نام طاہر انجم کا ہے۔

(نادر حسین، لاہور)

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو..... جدت پسند مسلم رہنما

سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی خصوصی تحریر

پاکستان کو جدید خطوط پر استوار کرنے والے قائد عوام شہید ذوالفقار علی بھٹو نے تاریخ کی ریت پر گہرے نقش ثبت کیے۔ 1973ء کا آئین، پاکستان اور بھارت کے درمیان طویل عرصے تک امن قائم رکھنے والا معاہدہ شملہ، تمام شہریوں کو یکساں حقوق فراہم کرنے والی سماجی اصلاحات، غیر وابستہ خارجہ پالیسی، ایٹمی پروگرام اور مل کے فوجی، سماجی اور معاشی ڈھانچوں کا استحکام ان کے کارناموں میں سے چند ہیں۔

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو عظیم دانشور تھے۔ وہ ایک فلسفی، ادب شناس اور شعلہ بیان مقرر تھے۔ ایمانداری، راست گوئی اور اقدار کا احترام ان کی شخصیت کا حصہ تھا۔ وہ غریبوں، مفلسوں اور کچلے ہوئے طبقات کے دوست تھے۔ ان کا اپنے اصولوں پر ایمان کامل تھا اور وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے آگے سر جھکانے سے انکاری تھے۔ انھوں نے اپنے اصولوں کی خاطر موت قبول کی اور شہادت کو گلے لگایا۔ وہ انسانی آزادی کے داعی تھے ان کے دورِ حکومت میں پاکستان نے ان افریقی ممالک کی کھلے عام، در پردہ دونوں طریقوں سے امداد کی جو اس وقت نسل پرستی کا شکار تھے اور ان پر اقلیتی حکومتیں مسلط تھیں۔

قائد عوام جدت پسند تھے اور قومیت کی اتحاد کی بنیاد سمجھتے تھے۔ انھوں نے بنیاد پرستی کو مسترد کر دیا تھا، انھوں نے غریبوں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ تیسری دنیا کے رہنما کی حیثیت سے وہ نسل پرستی، ناجائز قبضے اور استعماریت کے خلاف آواز بلند کرتے رہے۔ انھوں نے بڑی بے جگری سے قوموں کی آزادی کا دفاع کیا۔ جب 1973ء میں مشرق

www.bhutto.org

وسطیٰ میں جنگ چھڑ گئی تو انھوں نے مسلمان ممالک کی سرحدوں بشمول جولان کی پہاڑیوں کی حفاظت کے لیے پاکستانی فوج بھیجی۔ قائدعوام نے اپنی پچاس سالہ زندگی میں علاقائی، قومی اور بین الاقوامی مقاصد کی خدمت کی۔

قائدعوام کا سب سے اہم اور دلوں پر نقش ہو جانے والا کارنامہ عوام کے دلوں میں جمہوریت کی شمع روشن کرنا تھا۔ انھوں نے عوام کو بیدار کیا اور انھیں یہ شعور دیا کہ وہی اقتدار کا اصل سرچشمہ ہیں۔ انھوں نے کسانوں، محنت کشوں، طالب علموں، خواتین اور تمام عوام کو ان کے حقوق کا احساس دلایا جس کے ذریعے عام آدمی کی زندگیوں میں بہتری آ سکتی ہے۔

قائدعوام جمہوریت اور جمہوری اقدار کے شیدائی تھے اور انھوں نے آزادی کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ 1969ء میں جب عوام ایوب خان کی ڈکٹیٹرشپ سے نبرد آزما تھے قائدعوام لاہور ہائیکورٹ میں عوام کے جمہوری حقوق کے لیے آواز بلند کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ

''جی ہاں! مائی لارڈ! حقیقتاً جمہوریت تازہ ہوا کا جھونکا ہے اور موسم بہار کے پھولوں کی خوشبو ہے، یہ آزادی کا گیت ہے اس کا احساس دلوں کو گرما دیتا ہے، احساس سے بھی زیادہ جمہوریت بنیادی حق ہے، بالغ رائے دہی، ووٹ کا تقدس، آزادی صحافت ہے، کسی تنظیم سے منسلک ہونے کی آزادی ہے، عدلیہ کی آزادی ہے، قانون سازی واضح طور پر موجودہ حکومتی نظام میں موجود نہیں۔''

ٹالسٹائی نے اپنی کتاب وار اینڈ پیس کے آخری باب میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ تاریخ خیالات کے متحرک ہونے کا عمل ہے جس میں سیاسی لیڈران ایک چھوٹا سا کردار ادا کرتے ہیں۔ بس اوقات حقیقتاً خیالات تیزی سے متحرک ہوتے ہیں لیکن بعض اوقات خیالات برف کے پہاڑ کے پگھلنے سے بھی زیادہ آہستہ حرکت کرتے ہیں خیالات ایک سیاسی اور جمہوری کلچر میں آسانی سے متحرک ہوتے ہیں جس میں اختلاف کو جگہ ملتی ہے۔ مطلق العنان معاشروں میں تاریخ سرد خانوں میں جامد رہتی ہے اور قائدعوام سے پہلے پاکستان میں ایسا ہی تھا۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو ہی تھے جنھوں نے جامد اور مطلق العنان معاشرے کو ایک پرجوش اور متحرک معاشرے میں تبدیل کر دیا جس کی قیمت انھوں نے اپنی

www.bhutto.org

جان کا نذرانہ پیش کر کے ادا کی۔ انھوں نے فوجی حکومت کو کینسر سمجھا جو معاشرے کو گھن کی طرح چاٹ رہی تھی اور اسی لیے فوجی حکمت کی مخالفت کی۔ فوجی حکومت کو پاکستان کی اساس کے خلاف سمجھتے تھے کیوں کہ پاکستان ایک جمہوری عمل کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ سرد جنگ کی صورت حال میں جب سوویت یونین بحر ہند کے گرم پانی کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور بھارت کشمیر پر قابض تھا، قائدعوام ملک کا دفاع مضبوط بنانے کا عزم صمیم رکھتے تھے۔ ایٹمی پروگرام اور کامرہ ایروناٹیکل فیکٹری پاکستان کے دفاع کو ناقابل تسخیر بنانے میں شہید ذوالفقار علی بھٹو کا حصہ ہے۔ انھوں نے ہیوی مکینیکل کمپلیکس قائم کیا اور سقوط ڈھاکہ کے سانحے کے بعد فوج کا مورال بلند کیا۔ وہ 1971ء کی جنگ کے بعد بھارتی کیمپوں میں قید 90 ہزار جنگی قیدی واپس لائے اور جنگ میں بھارت کے قبضے میں گیا ہوا پاکستانی علاقہ وارگزار کروایا۔ انھوں نے پاکستانی جرنیلوں کو جنگی مقدمات سے بچایا تاکہ ملک کے نام اور وقار کو تحفظ دیا جاسکے، انھوں نے فوج کو بدنام ہونے سے بچایا۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ فوج کے سیاست میں ملوث ہونے سے فوج کے ایک ادارے کی حیثیت سے پیشہ ورانہ کارکردگی پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ:

''پاکستانی فوج ایک لمحے کے لیے بھی اپنی حقیقی ذمہ داری کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔ وہ سپاہی جو بیرکوں کو چھوڑ کر حکومتی بنگلوں میں منتقل ہو جاتے ہیں وہ جنگ ہار جاتے ہیں اور جنگی قیدی بن جاتے ہیں جس طرح 1971ء میں ہوا تھا۔''

ان کے یہ الفاظ بالکل سچ ثابت ہوئے جب 1981ء میں جنرل ضیاء نے یاچن گلیشئر ہار دیا اور 1999ء میں پاکستان یکطرفہ طور پر کارگل سے پسپا ہوگیا اور یہاں تک کہ اپنے سپاہیوں کی لاشیں تک قبول کرنے سے انکاری ہوگیا۔

بہت سارے لوگوں نے کہا تھا کہ بنگلہ دیش کے ظہور میں آنے کے بعد مغربی پاکستان تتر بتر ہو جائے گا۔ پاکستان 1971ء میں اپنی دوسری زندگی کے لیے قائدعوام کا مرہون منت ہے۔ یہ قائدعوام کی عظمت تھی کہ مایوس قوم کو وہ کوہ ہمالیہ کی بلندیوں پر لے گئے اور انھیں ستاروں پر کمند ڈالنے کا حوصلہ دیا۔ انھیں دنیا کے بڑے اور نمایاں لیڈروں نے خراج تحسین پیش کیا جنھوں نے شہید ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں ایک ایسا مسلمان جدت

www.bhutto.org

پسند لیڈر دیکھا جو دنیا کو امن اور خوشحالی کے راستے پر گامزن کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

قائدعوام نے پاکستان کو پُر جوش اور مستحکم بنایا۔ ملک میں مقصدیت کا احساس پیدا ہوا۔ پاکستان کی شرح پیداوار میں اضافہ ہوا اور عوام کو پاسپورٹ حاصل کرنے کا حق دیا جس کے بعد روزگار کے لیے غیر ممالک میں مقیم پاکستانیوں نے رقومات پاکستان بھیجنا شروع کردیں۔ مسلم ممالک پاکستان کو تقریباً 500 ملین ڈالر سالانہ عطیہ دے رہے تھے جس سے پاکستان کا بین الاقوامی مالیاتی اداروں پر انحصار کم ہوگیا۔ لوگوں کو روزگار کے مواقع ملے۔ انھوں نے حبس بے جا کے خلاف قانون اور بنیادی انسانی حقوق متعارف کروائے۔

خواتین کو آزادی دی گئی اور پولیس، دفتر خارجہ اور ماتحت عدلیہ میں خواتین کو شامل کیا گیا۔

انھوں نے ڈکٹیٹروں کو متنبہ کیا کہ وہ بنیادی جمہوریت کے نظام کو جمہوریت کا متبادل نہ بنائیں۔ انھوں نے کہا کہ

''ہم جمہوریت کا مطالبہ کرتے ہیں اور وہ ہمیں بنیادی جمہوریت دے رہے ہیں۔ اگر بنیادی جمہوریت ہے تو پھر دوسرے ممالک میں بنیادی جمہوریت کیوں نہیں؟ اگر یہ اتنا ہی اچھا نظام ہے تو یہ تمام دنیا میں رائج ہونا چاہئے تھا لیکن یہ نظام دنیا میں کہیں بھی نہیں، نہ ہی امریکا میں، نہ برطانیہ میں، نہ فرانس میں، نہ بھارت میں اور نہ ہی چین اور روس میں۔ اس کے باجود وہ ہمیں کہتے ہیں کہ یہ بہت زبردست نظام ہے۔'' ان کے مطابق ''ڈکٹیٹر کو بنیادی جمہوریت کے نظام سے بنایا گیا ہے جس میں ضلعی کونسل منتخب کرتی ہیں۔''

اس جدوجہد کے بعد عوام کی نظروں میں بنیادی جمہوریت کا نظام، بے وقعت ہوگیا اور عوام اس نظام کو اپنے حقوق غصب کرنے کا نظام سمجھنے لگے۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو اپنی اقدار میں سچے تھے۔ جب وقت آیا تو انھوں نے اپنی جان قربان کردی اور اپنے نظریات پر سمجھوتہ کرنے سے انکار کردیا۔ انھوں نے کہا کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' وہ بہادر شیر کی طرح جئے اور شہادت کو گلے لگا لیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ دکھائیں گے کہ ''عوام کا لیڈر کس طرح زندہ رہتا ہے اور کس طرح مرتا ہے۔'' پوری دنیا نے ان کی جان بخشی کے لیے اپیل کی کیوں کہ بین الاقوامی برادری کے امن اور خوشحالی کے لیے ان کی دانش بہت اہم تھی لیکن ایک خوفزدہ

www.bhutto.org

ڈکٹیٹر نے باوجود اس کے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے متفقہ طور پر قائدعوام کی جان نہ لینے کی اپیل کو نظر انداز کر دیا اور رات کی تاریکی میں پھانسی دینے کا حکم جاری کر دیا۔ قائد عوام کے آخری الفاظ ''میں بے قصور'' تھے۔

قائدعوام بہادری سے پھانسی گھاٹ چلے گئے اور پوری دنیا یہ جان کر ششدر اور مغموم ہوگئی اس نے اپنا عزیز بیٹا گنوا دیا۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس کی مذمت کی گئی۔ شہید بھٹو دنیا سے چلے گئے لیکن وہ تاریخ کے ایوان میں ان شخصیتوں کے ساتھ کھڑے ہیں جنھوں نے تاریخ کی سمت متعین کر دی۔ ان کی شہادت کے بعد متعدد ممالک میں آزادی کی تحریکوں نے جنم لیا اور دنیا بھر کے ممالک کے بڑے بڑے شہروں میں ہزاروں لاکھوں افراد ان کے قتل کی مذمت کے لیے جمع ہوئے۔ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے وہ جانتے تھے کہ عمر دوام ایسے مقصد کے لیے جان کی قربانی پیش کرنے سے ملتی ہے جو فرد سے عظیم ہو۔ تمام مقاصد انسانیت کو ظلم اور جبر سے آزاد کروانا عظیم ترین ہے۔

قائدعوام 1928ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انھیں 1979ء میں شہید کر دیا گیا لیکن وہ آج بھی عوام کے دلوں اور دماغوں میں زندہ ہیں۔ آج بھی قائدعوام آسمان پر ستارے کی طرح جگمگا رہے ہیں اور ان لوگوں کے لیے مشعل راہ ہیں جو ظلم کے قید خانوں میں مقید ہیں۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو شہید

پاکستان کے پہلے براہِ راست منتخب وزیراعظم اور پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کو پاکستان کے کروڑوں عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی پاداش میں تختہ دار تک لٹکایا گیا، کیوں کہ بھٹو شہید نے سیاست کو محلات سے نکال کر گلی کوچوں، کسانوں اور مزدوروں کی جھونپڑیوں تک پہنچا دیا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید نے اس ملک کو ایٹمی قوت بنانے میں جو کردار ادا کیا تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ اس ملک کو ایٹمی قوت بنانے کے علاوہ اسے عالم اسلام کا صحیح معنوں میں قلعہ بنانا چاہتے تھے مگر ایک ڈکٹیٹر نے عوام کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے لیڈر کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے دفاع کو ناقابل تسخیر بنانے اور عالم اسلام کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کے لیے جدوجہد کی اور عوام کو ظالمانہ نظام سے نجات دلانے اور انھیں اپنے حقوق حاصل کرنے کا شعور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عوام دشمن اور ملک دشمن قوتوں نے ان کے خلاف سازش کی اور ایک ڈکٹیٹر کو استعمال کرتے ہوئے انھیں من گھڑت مقدمے میں ملوث کر کے سزائے موت دی۔ بھٹو کو جسمانی طور پر مارنے والے بھٹو کے افکار اور نظریات کو ختم نہیں کر سکے۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید آج بھی عوام کے دلوں میں زندہ ہیں اور پاکستان کے عوام ذوالفقار علی بھٹو کے افکار کو ہی اپنے لیے مشعل راہ سمجھتے ہیں۔

4 اپریل ذوالفقار علی بھٹو شہید کی شہادت کا ہی دن نہیں بلکہ جنوبی ایشیاء اور خصوصی طور پر برصغیر میں آباد کچلی ہوئی ہر قسم کے وسائل سے محروم قوموں کے لوگوں کا دن کہا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے موجودہ مخلص اراکین شہید جمہوریت ذوالفقار علی بھٹو شہید کے ساتھ محترمہ بے نظیر بھٹو سے دلی لگاؤ رکھنے والے بھائی اور رفقاء گڑھی خدا بخش، لاڑکانہ پہنچ کر اور اپنے اپنے شہروں اور قصبوں میں عقیدت و احترام سے محفلوں کا انعقاد

www.bhutto.org

کر کے اور غرباء میں کھانا تقسیم کر کے مناتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید وطن کے مایہ ناز سپوت اور بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے بعد پاکستان کے سب سے زیادہ ہر دل عزیز اور قابل قدر راہنما تھے وہ پاکستان کے سیاسی افق پر ایک تابناک آفتاب کی حیثیت سے ابھرے لیکن سامراجی طاقتوں نے ان کو زوال سے ہمکنار کرنے کی ذلت آمیز کوشش کی جو پاکستان کو جہالت، غربت اور سیاسی عدم استحکام کا شکار دیکھنا چاہتے تھے۔ اس عظیم ہستی نے اپنی مختصر زندگی میں پاکستان اور پاکستانی عوام کے لیے وہ خدمات اور کارہائے نمایاں سرانجام دیے جن سے ان کا نام تاریخ پاکستان میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ بھٹو شہید اپنے عظیم کارناموں کی بدولت آج بھی زندہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اس لیے پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل مخلص کارکن جو ان کے حقیقی جانشین بھی ہیں پر فرض بنتا ہے کہ وہ خود بھی قائد عوام کے افکار و ارشادات کو اپناتے ہوئے پاکستان کی تعمیر و ترقی اور ملک میں جمہوریت کے نفاذ کے لیے اپنی کوششوں میں مزید پختگی لائیں اور اپنی قیادت کو ان راستوں پر چلنے کے لیے ان کا بھرپور ساتھ دیں جس کو ان کے قائد نے اختیار کیا تھا۔ اس وقت قائد کے افکار و اقوال پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہوئے بغیر نہ تو عوام کی کوئی خدمت کی جاسکتی ہے اور نہ ہی ملک کو آمرانہ قوتوں سے نجات دلا سکتے ہیں۔ آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم ایک نئے عزم اور حوصلہ سے صورت حال کا جائزہ لیں۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید کی ذات ایسی خوبیوں کا مجموعہ تھی ان کا اعتراف ان کے بدترین مخالف بھی کرتے ہیں۔ انھیں بھی ان کی صلاحیتوں کا بھرپور اعتراف کرنے پر مجبور ہونا پڑا ہے کیوں کہ ذوالفقار علی بھٹو شہید اپنے اللہ پر بھرپور یقین رکھتے تھے اور انھیں کسی دباؤ یا لالچ کی وجہ سے وہ اسے چھوڑ نہیں سکتے تھے یہی وجہ ہے کہ آخری وقت میں یعنی شہادت سے دو روز قبل انھوں نے کہا کہ میں اللہ کے پیدا کیے ہوئے کسی بھی انسان سے رحم کی اپیل کیسے کرسکتا ہوں میرا ضمیر صاف ہے جس الزام میں مجھے سزائے موت دی گئی ہے میں نے ایسا کوئی گناہ نہیں کیا۔ اب میں اللہ کے حضور پیش ہونے کو تیار ہوں۔ میں پھانسی چڑھوں گا اور بہادروں کی طرح پھانسی کو گلے لگا لوں گا۔ (2/ اپریل 1979ء کو جیل سے پیغام) ذوالفقار علی بھٹو شہید نے پاکستان کو جمہوریت کی علامت بنانے کا جو مشن شروع کیا تھا اب ان کی بہادر بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو انشاء اللہ پاکستان کے پندرہ کروڑ عوام کی حمایت سے اس مشن کو جاری رکھے ہوئے ہے اور وہ عوامی حاکمیت کے قیام تک عوامی اور جمہوری تحریک کو جاری رکھیں گے۔

www.bhutto.org

ملکی سیاست میں بھٹو خاندان کا کردار

فطرت کا اصول ہے کہ جب تاریکی بہت گہری ہو جائے تو روشنی کے آثار ہویدا ہوتے ہیں۔ خشک سالی انتہاؤں کو پہنچے تو برکھارت دھرتی کو جل کر دیتی ہے۔ درختوں سے پتے جھڑنے کا عمل مکمل ہو جائے تو نئی کونپلیں نمودار ہونے لگتی ہیں ایسے ہی قوموں کی تاریخ میں جب زوال اپنی آخری حدوں کو چھونے لگتا ہے تو پھر کوئی مسیحا قعر مذلت سے افراد کو نکالنے کے لیے آتا ہے۔ یوں تو پاکستان کی نصف صدی سے زائد کی تاریخ میں بہت سے نمایاں افراد ملک وقوم کو نجات دینے کے لیے سرگرم رہے لیکن ان سب نے بہت ہی نمایاں جاگیردار ذوالفقار علی بھٹو تھے جس کی آواز کے ارتعاش نے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ظالم وجود کو کپکپا کر رکھ دیا۔ جس کے ہاتھوں کے اشاروں نے غلاموں و آقا کی تمیز کو مٹا دیا جس کی جنبش آبرو نے صنعت کار کے سامنے مزدو کو بٹھا دیا جس کے حکم سے کارخانے داروں کے سرکام گاروں کی دہلیز پر جھکنے پر مجبور ہوگئے۔ جس کی جنبش زباں اور لب سے تاریخ رُخ بدلنے لگی۔

اس جہاں آب وگل اور اس دنیا کے رنگ و بو میں معجزے بھی رونما ہوتے ہیں کرامتیں بھی وجود پاتی ہیں اور کرشمے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں اور ایک ایسا ہی کرشمہ ساز قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو بھی تھا۔ جو خود تو سونے کا چمچ لے کر پیدا ہوا جس نے بچپن ہی سے اپنے آس پاس دولت کی ریل پیل دیکھی وسائل جس کے غلام، آسائش جس کی باندیاں تھیں راحتیں جس کا مقدر تھیں لیکن اس کے اندر کا احساس ہمیشہ جاگتا رہا۔ غریب عوام کے مسائل کا درد بچپن ہی سے دل میں تھا۔

4 اپریل انسانی تاریخ کے سیاہ ترین دنوں میں سے ہے آج سے 28 سال قبل

www.bhutto.org

اقتدار پر مست جرنیلوں نے عوام کے محبوب رہنما، عوام کے پہلے براہ راست منتخب وزیراعظم، قائدعوام ذوالفقارعلی بھٹو کو مفروضوں پر مبنی ایک افسانوی مقدمے کی آڑ میں راولپنڈی جیل میں پھانسی دے دی گئی تھی اس دن پورا ملک سوگوار تھا۔ ہر وہ شخص جس نے قائدعوام ذوالفقارعلی بھٹو شہید کو پاکستان کو نئے سرے سے تعمیر کرتے ہوئے دیکھا تھا درد غم سے نڈھال تھا اور قاتل اور اس کے حواری جشن منا رہے تھے۔ مگر اس ملک کا پسہ ہوا مظلوم طبقہ جس کو قائدعوام ذوالفقارعلی بھٹو شہید نے ظالمانہ نظام سے نجات دلوائی تھی انگلی پکڑ کر چلانا سکھایا تھا۔ حقوق حاصل کرنے کا احساس دلایا تھا۔ راٹھا کر جینے کا ڈھنگ سکھایا تھا اور گونگی زبانوں کو بولنا سکھایا تھا وہ سب کے سب 4 اپریل 1979ء کو سوگوار اور غمزدہ تھے۔ ایشیا سے لے کر یورپ تک بمبر سے لے کر کیل تک اور خیبر سے کراچی تک کروڑوں لوگوں کے گھروں میں چولہے نہ جلے تھے۔ معصوم بچے اپنے والدین کو روتا ہوا دیکھ کر دودھ پیے بغیر بھوکے سو گئے تھے۔ 28 سال گزرنے کے بعد آج بھی قائدعوام ذوالفقارعلی بھٹو شہید کے سیاسی مخالفین بھی اس بات کا اقرار کر رہے ہیں کہ ذوالفقارعلی بھٹو واقعی ایک غیر معمولی انسان تھے جس نے اپنے سر کو وقت کے حاکم کے سامنے جھکانے کے بجائے کٹوانے کو ترجیح دی مگر اپنے ملک کی آزادی اور وقار پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔

قائدعوام ذوالفقارعلی بھٹو شہید کے کچھ ناقدین جن کی آنکھوں پر ابھی تک تعصب کی پٹی چڑھی ہوئی ہے کہتے ہیں کہ ذوالفقارعلی بھٹو ایک فوجی آمر جنرل ایوب کی کابینہ میں وزیر تھا۔ اس حوالہ سے (میں بحیثیت پیپلز پارٹی کا ادنیٰ سا کارکن ہونے کی وجہ سے) عرض ہے کہ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح سے کبھی کسی نے سوال کیا تھا کہ آپ تو کانگریس میں شامل رہے ہیں تو قائداعظم نے جواب دیا تھا کہ میں کسی زمانے میں پرائمری سکول میں بھی پڑھا کرتا تھا اور آج بار ایٹ لاء ہوں اور برصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کی جنگ لڑ رہا ہوں قائدعوام ذوالفقارعلی بھٹو کے مخالفین یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ بھٹو شہید نے جنرل ایوب خان کی غلط پالیسیوں سے اختلاف کر کے اقتدار کو ٹھوکر ماری تھی اور قائدعوام پر تنقید پر جب اور کوئی بہانہ نہیں ہوتا تو کہتے ہیں کہ بھٹو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر رہے ہیں۔ یہ لوگ دانستہ بھول جاتے ہیں کہ اس وقت حالات کیا تھے اقتدار پرست جرنیلوں نے حوس اقتدار میں ہر سمت تباہی و بربادی کردی تھی اپنے ملک کے عوام

www.bhutto.org

کے سامنے اکڑ دیکھانے والوں نے بھارتی جرنیلوں کے سامنے بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے تھے اور تو اور مغربی کمانڈ کی حالت یہ تھی کہ اس نے ہزاروں مربع زمین بھارت کے حوالے کر دی تھی۔ جب سب کچھ برباد ہو چکا قوم کو شکست کی ذلت سے دوچار کرنے کے بعد تن تنہا بے یارو مددگار چھوڑ دیا گیا تھا تو اس وقت قوم اور ملک کو کسی مسیحا کی تلاش تھی وہ مسیحا قوم کو قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو شہید کی صورت میں ملا جس نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کو بروکار لاتے ہوئے ایک شکست خوردہ اور بکھری ہوئی قوم کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کر کے جینے کا نیا حوصلہ دیا اور نئے پاکستان کی تعمیر کی ایک ایسا پاکستان جو عوام کا ہو قائد عوام بھٹو شہید نے عوام کو یہ باور کروایا کہ تم ہی اصل طاقت ہو۔ ملک و قوم کو پہلے متفقہ اسلامی آئین 1973ء کا تحفہ دیا بھٹو شہید نے سیاست کو محلات اور ڈرائینگ روموں سے نکال کر غریبوں کی جھونپڑیوں میں لا کھڑا کر دیا۔ قائد عوام بھٹو شہید نے کہا کہ میں اپنے ملک کے غریب عوام سے عشق کرتا ہوں اور اس عشق میں میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار ہوں وقت آنے پر میں اپنی قوم کے لیے جان بھی قربان کردوں گا۔ تو اس وقت کے مفاد پرستوں نے اس بات کا مذاق اڑایا تھا اور کہا تھا کہ ایک نازک اور نفیس جاگیردار کیسے جان قربان کرے گا لیکن قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو شہید اپنے قول و عزم کے پکے تھے وہ پھانسی کے پھندے پر جھول گئے اور قربانی کی ایک ایسی مثال قائم کی کہ دنیا کی سیاسی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

جس عظیم انسان نے ایک نیا پاکستان تعمیر کیا ملک کو ایٹمی ٹیکنالوجی دی کہوٹہ ریسرچ لیبارٹری سے لے کر کامرہ کمپلیکس، ہیوی میکینکل کمپلکس، پورٹ قاسم، سٹیل ملز جیسے ادارے بنا کر پاکستان کو ایک باوقار ملک بنایا اور پاکستان کا ہر وہ ادارہ جو ٹیکنالوجی کا ہو یا درس و تدریس کا تمام ادارے قائد عوام بھٹو شہید نے بنائے۔ وقت کی ستم ظریفی اور حالات کا جبر دیکھیے کہ جس عظیم انسان نے آزادی کا مفہوم سمجھا یا پاکستانی کو ناقابل تکسیر بنایا انھیں انتہائی بے دردی کے ساتھ پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا گیا۔ ہاں! یہ درست ہے کہ امیرکہ سیکرٹری خارجہ ہینری کسنجر نے قائد عوام بھٹو شہید کو دھمکی دی تھی کہ تم پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کے خواب سے دستبردار ہو جاؤ ورنہ تمہیں نشانِ عبرت بنا دیا جائے گا۔ مگر قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو شہید نے ہینری کسنجر کی دھمکی کی کوئی پرواہ نہیں کی مگر ان لوگوں کا کیا کیا

www.bhutto.org

جائے جنھوں نے میر جعفر اور میر صادق کا کردار ادا کیا۔

کوئی کیسے بھول سکتا ہے کہ اس وقت دینی مدرسوں کو منی چینجر کی دکان بنا دیا گیا تھا یہ تماشہ پوری دنیا نے دیکھا کہ نظام مصطفیٰ کی تحریک میں حصہ لینے والوں میں ڈالر تقسیم کیے جارہے تھے اسلام کے نام پر عوام کو کیا کیا سبز باغ دکھائے گئے تھے اسلام کے نام پر ملک وقوم کو دہشت گردی اور کلاشنکوف کلچر دیا گیا اور اس آڑ میں قوم کو چرس اور ہیروئن جیسے دھندے پر لگا کے آئے اقتدار کو طول دیا گیا جس نے اُل کی جڑوں کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیا پوری قوم آج بھی اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔

جس عظیم انسان قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو شہید نے پاکستان کی تعمیر کی تھی ملک و قوم کو ہی نہیں بلکہ امت مسلمہ کو بھی ایٹمی ٹیکنالوجی کا تحفہ دیا تھا آج اس کی عظیم بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو کو دھمکیاں دی جارہی ہیں کہ خبردار پاکستان مت آؤ ورنہ سنگین نتائج کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اگر یہ دھمکیاں غیر ملکی دیتے تو کوئی افسوس نہ ہوتا مگر یہ دھمکیاں پاکستان کے محافظ دے رہے ہیں۔ میں اکثر یہ سوچتا ہوں کہ اچھا ہوا قائد اعظم کی بیٹی یا ان کے خاندان کا کوئی فرد اس ملک میں نہیں ہے ورنہ ان کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا؟ لیکن قائد انقلاب چیئرپرسن پاکستان پیپلز پارٹی سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نے تو ایٹمی پروگرام پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان کو میزائل ٹیکنالوجی دی میراج طیارے بھی تو انھیں کی عنایت ہیں اس طرح ملک کے دفاع کو ناقابل تسخیر بنانے میں بھٹو شہید خاندان کا اہم کردار ہے پھر بھی قائد انقلاب محترمہ بے نظیر بھٹو انتقام کا شکار کیوں ہیں؟ بات صرف یہ ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو شہید کی بیٹی ہیں۔ جو قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو شہید کی طرح اپنے ملک کے عوام سے محبت کرتی ہیں آج ہم ملک میں سیاہ سفید کے مالک حکمرانوں سے پوچھتے ہیں کہ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو شہید نے پاکستان کو ایٹمی ٹیکنالوجی دی 1973ء کا متفقہ آئین دیا 90,000 فوجیوں کو بھارت کی جیلوں سے آزادی دلوائی، قائد انقلاب محترمہ بے نظیر بھٹو نے پاکستان کے دفاع کو ناقابل تسخیر قوت بناتے ہوئے مزائیکل ٹیکنالوجی اور میراج طیارے دیے مگر آپ نے اپنی قوم و ملک کو کیا دیا سوائے دکھوں اور مشکلات کے آج قوم کو پھر ایک بھٹو کی ضرورت ہے اور وہ بھٹو قائد انقلاب محترمہ بے نظیر بھٹو کی صورت میں موجود ہے۔ آج پاکستان جس نازک صورتِ حالات سے دو چار

ہے اس میں ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کی قومی سطح کی لیڈر سابق وزیراعظم پاکستان چیئرپرسن پاکستان پیپلز پارٹی محترمہ بےنظیر بھٹو کو پاکستان آنے کی اجازت دی جائے اور ان پر قائم بے بنیاد اور من گھڑت مقدمات ختم کیے جائیں آج کاروانِ بھٹو کا ہر سپاہی اپنی سپہ سالار قائد انقلاب محترمہ بےنظیر بھٹو کی قیادت میں جمہوریت کی بحالی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے جلد ہی موجودہ حکمران ملک و قوم کو مسائل کے گرداب سے نکالنے کے لیے بھٹو ازم کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوں گے کیوں کہ چیلنج جتنا بڑا ہو اس کے مقابلے کے لیے اتنی بڑی شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے جو قائد انقلاب محترمہ بےنظیر بھٹو کے سوا کوئی اور نہیں۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست میں دلچسپی

ذوالفقار علی بھٹو کے والد شاہ نواز بھٹو کا بچپن زیادہ خوشگوار نہ تھا کیوں کہ کم سنی میں ہی ان کے سر پر ان ذمہ داریوں کا بوجھ پڑ گیا جن فرائض سے انھیں معمول کے حالات میں 25 یا 30 برس کی عمر کے بعد نبرد آزما ہونا تھا۔ شاہ نواز بھٹو کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا لیکن خاندانی مسائل اور زمینداری کے امور میں وہ ایسے الجھے کہ بیرون ملک جا کر تعلیم حاصل کرنے کے متعلق ان کے تمام خواب ادھورے رہ گئے۔ تاہم انھوں نے شادی کے بعد اپنی اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، خصوصاً ذوالفقار علی بھٹو کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی حالاں کہ ذوالفقار علی بھٹو کی والدہ خورشید اپنے لخت جگر کی جدائی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ شاہ نواز بھٹو کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ذوالفقار علی بھٹو نے بیرون ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور انھوں نے بہت کم عمری میں ہی ملکی اور بین الاقوامی سیاست میں حصہ لیا۔ اس کی ایک مثال ذوالفقار علی بھٹو کا قائد اعظمؒ کے نام لکھا جانے والا وہ خط ہے جس پر 26 اپریل 1945ء کی تاریخ درج ہے۔ اس خط میں ذوالفقار بھٹو نے قائد اعظمؒ کو لکھا کہ وہ اس وقت کم عمر ہیں اور ایک سکول میں زیر تعلیم ہیں لیکن وقت آنے پر وہ پاکستان کے لیے اپنی جان بھی دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ شاہ نواز بھٹو کے قائد اعظمؒ کے ساتھ ذاتی تعلقات تھے، خصوصاً 1945ء کے بعد قائد اعظمؒ نے تحریک پاکستان کے سلسلے میں شاہ نواز بھٹو سے رابطہ برقرار رکھا جن کا شمار سندھ کے بڑے سیاستدانوں میں ہوتا تھا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی تحریک پاکستان کے دنوں میں شاہ نواز بھٹو سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقاتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھٹو خاندان نے کانگریس کے بجائے مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ قیام پاکستان کے وقت ذوالفقار علی بھٹو کی عمر 19 سال تھی۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے بارے میں ان کے ذاتی دوستوں اور عزیز و اقارب کی متفقہ رائے ہے کہ وہ خاندان بھر میں سب سے زیادہ ذہین تھے اور شاہ نواز بھٹو کو پختہ یقین تھا کہ ان کا صاحبزادہ کبھی سیاست میں نمایاں مقام حاصل کرے گا۔ شاہ نواز بھٹو کو اپنے ذرائع سے وقتاً فوقتاً اطلاعات ملتی رہتی تھیں کہ ذوالفقار علی بھٹو پڑھائی کے ساتھ ساتھ انگریز لڑکیوں میں بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔ ان اطلاعات پر شاہ نواز نے بھٹو کو متعدد مرتبہ خطوط لکھے کہ وہ اپنی پڑھائی پر پوری توجہ دے۔ جواباً بھٹو نے اپنے والد کو یقین دلایا کہ ان کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں پرفارمنس سینکڑوں ایشیائی باشندوں سے بہتر ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے نہ صرف اپنے ہم عصر سیاستدانوں کو اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے مات دی بلکہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ درجنوں غیر ملکی لڑکیوں کے ان کے ساتھ غیر معمولی تعلقات استوار رہے اور ان میں سے کسی ایک کو تو یقین ہو چکا تھا کہ بھٹو ان سے شادی کریں گے لیکن یہ عزت ایک دبلی پتلی، خوبصورت اور اصفہانی گھرانے کی دراز قد لڑکی نصرت کو اس وقت ملی جب ذوالفقار علی بھٹو نے 1950ء میں انھیں شادی کی پیشکش کی۔ شاہ نواز بھٹو اور ان کی اہلیہ ذوالفقار علی بھٹو کے اس فیصلے سے قطعاً خوش نہ تھے جب کہ خود نصرت کے والد ایک برس تک گومگو کی کیفیت میں مبتلا رہے کیوں کہ نصرت ایرانی تھیں اور بھٹو سندھی تھے۔ بیگم نصرت بھٹو جن کی تاریخ پیدائش 23 مارچ 1929ء تھی، شروع میں ذوالفقار علی بھٹو سے شادی کرنے پر تیار نہ تھیں کیوں کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھے اور ان کو خوبصورت لڑکیوں کے حلقے میں دل پھینک تصور کیا جاتا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو کو جب بھٹو نے شادی کی پیشکش کی تو انھوں نے مسکرا کر ٹال دیا کیوں کہ پاکستان سے واپس جاتے ہی انھیں یاد بھی نہ رہے گا کہ انھوں نے کسی لڑکی کو شادی کی پیشکش بھی تھی۔ لیکن 1951ء میں بھٹو نے دوبارہ پاکستان آنے کے بعد نصرت سے رابطہ قائم کیا اور انھیں اپنی محبت کا یقین دلایا۔ اس مرتبہ نصرت اصفہانی کو سنجیدہ رہنا پڑا اور انھوں نے شادی پر آمادگی ظاہر کردی۔ اب ذوالفقار علی بھٹو کے لیے مرحلہ یہ تھا کہ وہ اپنے والدین کو شادی پر کس طرح آمادہ کریں۔ ان کی والدہ تو خیر کسی نہ کسی طرح مان ہی جاتیں، لیکن مسئلہ شاہ نواز بھٹو کا تھا جو قطعاً اس بات کے حق میں نہ تھے کہ ان کا صاحبزادہ خاندان سے باہر شادی کرے اور مستقبل میں ان کے آباؤ اجداد کی جائیداد غیروں میں چلی جائے۔ شاہ نواز بھٹو نے

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کو نصرت اصفہانی سے شادی کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تو ایک روز بھٹو انھیں ایک مسجد میں لے گئے جہاں مولوی صاحب ان کا نکاح پڑھانے کے لیے تیار تھے لیکن نصرت اصفہانی نے اس انداز میں شادی کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ ان کا موقف تھا کہ شادی ایک ایسا فریضہ ہے جسے چھپ چھپا کر انجام نہیں دینا چاہیے۔ چنانچہ اپنے والدین کے رویے سے بد دل ہو کر بھٹو نے خاندان کے بعض افراد کے ذریعے والدہ کو یہ پیغام دیا کہ وہ اس طرح کی زندگی سے تنگ آ گئے ہیں۔ گویا بھٹو کی طرف سے یہ دھمکی تھی کہ اگر انھیں نصرت اصفہانی سے شادی نہ کرنے دی گئی تو وہ کچھ بھی کر لیں گے جس پر ان کی والدہ محترمہ خورشید نے انھیں کہا کہ ''بیٹا آج کے بعد وہی ہوگا جو تم چاہو گے'' اس طرح ذوالفقار علی بھٹو کو نصرت اصفہانی سے شادی کرنے کی اجازت مل گئی۔ یوں 8 ستمبر 1951ء کو نصرت اصفہانی بھٹو کی شریک حیات بن گئیں۔ شادی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو اپنی دوسری اہلیہ کے ساتھ لندن چلے گئے جہاں انھوں نے زندگی کے بہترین ایام گزارے۔ تاہم کچھ عرصے بعد نصرت بھٹو واپس پاکستان آ گئیں کیوں کہ ان کی بیرون ملک موجودگی کے باعث بھٹو کی پڑھائی متاثر ہونے کا خدشہ تھا۔ یہ وہ دور ہے جب پاکستان میں سیاست سخت انتشار کا شکار تھی۔ اقتدار کے ایوانوں میں سازشیں عروج پر تھیں اور غیر ملکی طاقتیں خطے میں اپنے مفادات کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے نئے مہروں کی تلاش میں سرگرداں تھیں۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو کی ابتدائی سیاسی زندگی

ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست میں دلچسپی کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد شاہ نواز بھٹو سال میں کم از کم ایک مرتبہ اعلیٰ حکومتی عہدیداروں اور سیاستدانوں کو شکار کی دعوت پر لاڑکانہ ضرور بلایا کرتے تھے۔ اسکندر مرزا بھی کئی مرتبہ لاڑکانہ آتے اور ان کی بھٹو کے ساتھ علیک سلیک بھی ہوتی۔ ذوالفقار علی بھٹو ان دنوں قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ شاہ نواز بھٹو چوں کہ خود اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر پائے تھے اس لیے انھوں نے پوری کوشش کی کہ ان کے صاحبزادے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور اس ضمن میں بھٹو کو ملک سے باہر بھجوایا گیا۔ اسکندر مرزا نے 1950ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست میں دلچسپی کو دیکھتے ہوئے انھیں کراچی کا میئر بنانے کی پیشکش کی جسے بھٹو نے نہایت خوبصورتی سے ٹھکرا دیا کیوں کہ بھٹو کی نظر وفاقی وزارت پر تھی اور وہ میئر بننا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے والد شاہ نواز جانتے تھے کہ آنے والے دنوں میں ایوب خاں اسکندر مرزا کی چھٹی کروا دے گا اور اس کا اظہار انھوں نے اپنے کئی ایک قریبی دوستوں سے کیا لیکن بھٹو کی رائے یہ تھی کہ اسکندر مرزا نہایت تجربہ کار سیاستدان ہیں اس لیے وہ آسانی سے اقتدار نہیں چھوڑیں گے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اسکندر مرزا نے مارچ 1958ء میں ایک وفد کے ہمراہ جنیوا بھجوایا جہاں سے انھوں نے اسکندر مرزا کو خط لکھا کہ آنے والا وقت ثابت کرے گا کہ آپ قائداعظمؒ سے بھی بڑے لیڈر ہیں۔ اسکندر مرزا سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے اپنے تمام اہم کارڈز ایوب خاں کے ہاتھ میں دے دیے۔ اگر وہ ایوب خاں کو فری ہینڈ نہ دیتے تو ان کی اتنی جلدی چھٹی نہ کرائی جاتی۔ اسکندر مرزا کی اپنی ہی غلطیوں کے باعث ایوب خاں کو کھیل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ ستمبر 1958ء میں ذوالفقار علی بھٹو کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کے

www.bhutto.org

والد کی اسکندر مرزا کی سیاسی ذہانت کے بارے میں رائے درست تھی اس لیے انھوں نے اسکندر مرزا کے بجائے ایوب خاں کے ساتھ رشتہ امید اختیار کر لیا۔ اسکندر مرزا نے سیاسی چالیں چلتے ہوئے 17/اکتوبر 1958ء کو ایوب خاں کی مدد سے سول حکومت کو ختم کر کے مارشل لاء لگایا۔ وہ ایوب خاں کو اپنے انڈر رکھنا چاہتے تھے جب کہ ایوب خاں کو 20 دنوں میں ہی اندازہ ہو گیا کہ سیاستدان کی حیثیت تو محض ایک کٹھ پتلی کی سی ہوتی ہے اور اصل قوت تو فوج کے پاس ہے، چنانچہ 27 اکتوبر 1958ء کو جب اسکندر مرزا نئی وفاقی کابینہ بنا کر ایوب خاں کو اپنے ماتحت کرنے کے بعد سکون کا سانس لے رہے تھے، ایوب خاں نے تین جرنیلوں کو ان کے پاس بھیجا جن کے ذمہ اسکندر مرزا سے استعفیٰ حاصل کرنا تھا۔ اسکندر مرزا نے 27 اکتوبر 1958ء کی صبح جو کابینہ بنائی تھی اس میں بھٹو کا نام بطور وزیر تجارت شامل تھا لیکن اس سے پہلے کہ یہ کابینہ امور مملکت سنبھالتی، ایوب خاں نے سیاست کی بساط الٹ دی اور اسکندر مرزا کو بندوق کی نوک پر اقتدار سے الگ کر کے لندن بھیج دیا گیا جب کہ 28 اکتوبر 1958ء کو ایوب خاں ملک کے نئے صدر بن گئے اور فوج کا ڈنڈا بھی ان کے ہاتھ میں رہا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے جلد ہی ایوب خاں کے دل میں جگہ پالی کیوں کہ بھٹو مرحوم ایوب خاں کو والد کا درجہ دیتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ایوب خاں کے امیج کو عوام میں بہتر بنانے کے لیے دن رات کام کیا۔ انھوں نے جلسوں میں ایوب خاں کے حق میں تقریریں کیں اور انھیں قوم کے لیے نجات دہندہ قرار دیا۔ 1959ء میں جب ایوب خاں نے بنیادی جمہوریت کا تصور پیش کیا تو بھٹو نے اسے زبردست آئیڈیا قرار دیا اور بنیادی جمہوریت کے تصور کے حق میں تقریریں کیں۔ چوں کہ ایوب خاں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے اپنے محسن اور دوست اسکندر مرزا کے ساتھ بے وفائی کی تھی اس لیے انھیں ہمیشہ یہ خطرہ لگا رہا کہ کہیں جنرل موسیٰ خاں بھی ان کے ساتھ ہاتھ نہ کر جائیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جنرل موسیٰ خاں بھی فور سٹار جنرل تھے جب کہ ایوب خاں کے کندھے پر بھی اتنے ہی بیج لگے ہوتے تھے۔ مارشل لاء کے نفاذ اور صدر مملکت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ایوب خاں کے لیے ایک برس ایسے گزرا جیسے ایک صدی گزری ہو۔ جنرل موسیٰ خاں فوج کے اجلاسوں میں جنرل ایوب خاں کو زیادہ لفٹ نہیں کراتے تھے۔ اس مسئلے کا حل بھی ذوالفقار علی بھٹو نے ہی تجویز کیا۔ انھوں نے ایوب خاں کو

www.bhutto.org

مشورہ دیا کہ آپ فیلڈ مارشل بن جائیں، اس طرح 25 اکتوبر 1959ء کو مارشل لاء کے نفاذ کے ایک سال بعد ایوب خاں نے ''فیلڈ مارشل ایوب خاں'' کہلوانا شروع کر دیا اور عہدے کے اعتبار سے انھیں جنرل موسیٰ خاں پر سبقت حاصل ہوگئی۔

ذوالفقار علی بھٹو کو وزیر خارجہ بننے کا جنون کی حد تک شوق تھا اور اپنی اس خواہش کا براہِ راست اظہار کرنے کے بجائے وہ امور خارجہ کے حوالے سے ایوب خاں کو نئی نئی تجاویز دیا کرتے تھے۔ ایوب خاں کے دورِ حکومت میں وزارت خارجہ کا قلمدان منظور قادر کے ہاتھ میں تھا جو بھٹو کی وجہ سے بہت زچ تھے کیوں کہ بھٹو نے وزارت خارجہ سے متعلقہ امور میں مسلسل مداخلت کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ 1962ء میں جب ایوب خاں نے قومی اور صوبائی اسمبلی کے الیکشن کرائے تو بھٹو بلا مقابلہ ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوگئے۔ ایوب خاں نے 1962ء کے انتخابات کے بعد کابینہ بنائی تو انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے بجائے محمد علی کو وزیر خارجہ بنا دیا کیوں کہ بھٹو کی عمر اس وقت بہت کم تھی۔ تاہم جنوری 1963ء میں جب محمد علی کو دل کا دورہ پڑا اور وہ وزارت خارجہ جیسے امور سنبھالنے کے قابل نہ رہے تو ایوب خاں نے بھی سب سے بڑی خواہش پوری کرتے ہوئے انھیں 35 برس کی عمر میں ملک کا وزیر خارجہ بنا دیا۔ بھٹو نے وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالتے ہی چین کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی کوشش شروع کر دی اور 2 مارچ 1963ء کو انھوں نے چین کے ساتھ بطور وزیر خارجہ پہلا معاہدہ کیا۔ اکتوبر 1963ء میں بھٹو نے بطور وزیر خارجہ امریکی صدر جان ایف کینڈی سے ملاقات کی۔ 27 مئی 1964ء کو جب پنڈت جواہر لعل نہرو فوت ہوئے تو ایوب خان نے ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے نمائندے کے طور پر بھارت بھیجا تاکہ وہ ایوب خاں کی طرف سے پنڈت جواہر لعل نہرو کی میت پر پھول ڈالیں۔ اندرا گاندھی سے ذوالفقار علی بھٹو کی بطور وزیر خارجہ پہلی ملاقات نہرو کی وفات کے موقع پر ہوئی۔ بھٹو نے 1963ء میں ہی محسوس کر لیا تھا کہ اندرا گاندھی بھارت کی سیاست میں اہم کردار ادا کریں گی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اندرا گاندھی نے 30 مئی 1963ء کو بھٹو کے ساتھ بین الاقوامی سیاست کے موضوع پر 2 گھنٹے تبادلہ خیال کیا جب کہ امور خارجہ بھٹو کا بھی پسندیدہ Subject تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے چین کے ساتھ مسلسل بڑھتے ہوئے تعلقات امریکا کے لیے تشویش کا باعث تھے۔ امریکا نے جون 1963ء میں ہی ایوب خاں پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا کہ وہ بھٹو کی جگہ

www.bhutto.org

کسی اور شخص کو وزارت خارجہ کا قلمدان عطا کر دیں لیکن مصلحتوں کے باعث ایوب خاں یہ فیصلہ نہ کر پائے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ذوالفقار علی بھٹو نے جونئی خارجہ پالیسی بنائی تھی اس کو حتمی شکل دینے سے پہلے انھوں نے ایوب خاں کے ساتھ گھنٹوں بحث کی تھی اور ایوب خاں خود بھی اس بات سے آگاہ تھے کہ بھٹو ملک کے وسیع تر مفاد میں خارجہ پالیسی میں تبدیلیاں لا رہے ہیں۔ محض ذوالفقار علی بھٹو کی چین دوستی کے باعث امریکا نے پہلے پاکستان کے لیے منظور کیا جانے والا 400 ملین ڈالر کا قرضہ معطل کیا اور پھر امریکی محکمہ خارجہ نے بھارت کو دفاعی لحاظ سے مضبوط کرنے کی کوشش شروع کردی۔ اس اقدام کا مقصد سوائے اس کے کوئی اور نہ تھا کہ امریکا چاہتا تھا کہ ایوب خاں اپنی خارجہ پالیسی واشنگٹن کی Dictation کے مطابق ترتیب دیں۔ ایوب خاں کے انکار پر امریکی سی آئی اے حرکت میں آئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپوزیشن جماعتیں جو ایوب خاں سے خوفزدہ ہو کر دبک گئی تھیں اچانک متحدہ محاذ کے نام سے ایک نیا سیاسی اتحاد بنا کر میدان میں نکل آئیں۔ اس نئے محاذ میں جماعت اسلامی، مولانا بھاشانی، کونسل مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی اور عوامی لیگ شامل تھی۔ ان تمام اپوزیشن جماعتوں نے ایوب خاں کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے فاطمہ جناح سے رابطہ قائم کیا جن کی عمر اس وقت 71 برس تھی اور وہ سیاست سے الگ ہو کر اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی تھیں۔ اپوزیشن جماعتوں کے اصرار پر مادرِ ملت نے صدارتی الیکشن میں ایوب خاں کا مقابلہ کیا لیکن دھاندلی جیت گئی اور جمہوریت ہار گئی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے صدارتی الیکشن میں فاطمہ جناح کے خلاف تقریریں کیں۔ اگرچہ ایوب خاں صدارتی الیکشن میں کامیاب ہوگئے لیکن اس کے باوجود ان کے خلاف امریکی سازش جاری رہی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1956ء سے 1964ء تک اپنی عملی سیاسی زندگی کے دوران بہت کچھ سیکھا۔ انھیں اس عرصے کے دوران نہایت اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ کسی بھی حکمران کے لیے امریکی سوچ اور پالیسی کے خلاف کام کرنا آسان نہیں ہوگا اور اس کا انھیں ذاتی طور پر تجربہ ہو چکا تھا۔ 1969ء کے درمیان جب ایوب خاں کو اندرونی سطح پر اپوزیشن کی شدید مخالفت کا سامنا تھا، ذوالفقار علی بھٹو بھی خاندانی جھگڑوں کا شکار ہو چکے تھے۔ جس کی بنیادی وجہ ان کے حسنہ شیخ کے ساتھ تعلقات تھے جن کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا اور وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر کراچی آ چکی تھیں اور بھٹو نے ان کے

www.bhutto.org

لیے رہائش کا بندوبست کر رکھا تھا۔ حسنہ شیخ بھٹو کی کمزوری جانتی تھیں اس لیے تنہائی کے لمحات میں وہ ان کے ساتھ بین الاقوامی امور پر گھنٹوں بحث کیا کرتی تھیں اور بھٹو ان کے ساتھ گپ شپ کر کے بہت خوشی محسوس کرتے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو کو جب اس صورت حالات کا پتا چلا تو انھوں نے ایوب خاں کی اہلیہ کے ذریعے ایوب خاں تک شکایت پہنچائی۔ چنانچہ ایوب خاں نے بھٹو اور ان کی اہلیہ کے درمیان صلح کرائی وگرنہ بیگم نصرت بھٹو تو طلاق لینے کے لیے تیار تھیں۔ 1969ء کے آخری مہینوں میں پاکستان اور امریکا کے درمیان تعلقات خراب ہو چکے تھے جب کہ اس کے برعکس امریکا اور روس نے بھارت کو دفاعی اعتبار سے مضبوط کر دیا تھا۔ پاکستان کو لے دے کر اللہ تعالیٰ کے بعد بس چین کا سہارا تھا اس لیے اس وقت جب کہ بھارت کو روس سے مسلسل نیا اسلحہ مل رہا تھا، ذوالفقار علی بھٹو نے چین کو اپنی دفاعی ضروریات سے آگاہ کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 1965ء کے شروع میں ہی ایوب خاں کو قائل کر لیا تھا کہ کشمیر کو آزاد کرانے کا وقت آ گیا ہے۔ اس لیے مئی، جون 1965ء میں دو خفیہ منصوبوں، اپریشن گلبرالٹر اور اپریشن گرینڈ سلیم کے تحت کشمیری مجاہدین کو اسلحہ اور تربیت فراہم کی گئی۔ امریکی سی آئی اے کو پاکستان کے دونوں منصوبوں کا کافی تاخیر سے علم ہوا۔ اپریل 1965ء میں ایوب خاں اور امریکی صدر جانسن کی ملاقات طے تھی لیکن بدلتی ہوئی صورت حالات کے باعث امریکا نے یہ ملاقات منسوخ کر دی جس سے صاف واضح ہو گیا کہ امریکا کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہے اور مشکل لمحات میں امریکا پاکستان کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔ ایوب خاں اسی بات سے پریشان تھے لیکن ذوالفقار علی بھٹو اور بعض جرنیلوں کے مشوروں کے باعث وہ اس بات پر تیار ہو گئے کہ کشمیری مجاہدین کو پہلے مرحلے میں محدود امداد دی جائے اور جب مثبت نتائج نکلنے کا یقین ہو جائے تو پاکستان مقبوضہ کشمیر پر حملہ کر کے اسے آزاد کرا لے۔ 29 اگست 1965ء کو فیلڈ مارشل ایوب خاں نے جنرل موسیٰ خاں کو، جو فوج کے سربراہ تھے، خط لکھا کہ کشمیری مجاہدین کی جس قدر ممکن ہو سکے مدد کی جائے، جس پر 5 ستمبر 1965ء کو پاکستان نے کشمیر کو آزاد کرانے کے لیے بھارت کو محدود سطح کی جنگ میں الجھا دیا۔ اگرچہ پاکستان کو شروع میں کامیابی حاصل ہوئی لیکن 6 ستمبر 1965ء کو جب بھارت نے امرتسر اور فیروز پور کے راستے پاکستان پر حملہ کیا تو صورت حالات تبدیل ہو گئی۔ امریکا کے وزیر خارجہ چن لی نے حالاں کہ 4 ستمبر 1965ء کو

www.bhutto.org

ہی اپنے دورہ پاکستان کے موقع پر حکومت کو بعض حساس معلومات فراہم کی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ بھارت نے پاکستان پر بڑے حملے کی تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔ ایوب خاں نے 4 ستمبر 1965ء کی رات ہی ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی بریگیڈئر ریاض کو حکم دیا کہ وہ ان مقامات کا پتا چلائیں جہاں سے بھارت کی فوجیں حملہ آور ہوسکتی ہیں۔ قبل اس کے کہ آئی ایس آئی بھارت کے فوجی منصوبوں کا سراغ لگا پاتی، اچانک امرتسر اور فیروز پور کے راستے سے بھارت نے پاکستان پر چڑھائی کردی۔ ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل گل حسن نے فوری طور پر ائر مارشل اصغر خاں کے ہمراہ چین سے مذاکرات کیے۔ چین نے محدود سطح پر پاکستان کو جنگی ہتھیار سپلائی تو کردیے لیکن یہ مقدار اس قدر نہ تھی جس طرح روس نے بھارت کو اسلحہ فراہم کر دیا تھا۔ لیکن پاکستان کو اس جنگ کے باوجود مطلوبہ مقاصد حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اسی موقع پر سیاسی چال چلتے ہوئے 22 ستمبر 1965ء کی رات اقوام متحدہ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے بھارت کے ساتھ ایک ہزار سال تک جنگ کرنے کا نعرہ لگایا۔ ذوالفقار علی بھٹو کا یہ نعرہ انھیں عوامی سطح پر مقبول کرنے کا باعث بن گیا۔ بھٹو نے اپنے دورہ امریکا کے دوران اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں دھواں دار تقریریں کر کے نہ صرف پاکستان میں شہرت حاصل کی بلکہ ان کی انٹر نیشنل لیول پر بھی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا۔ ایوب خاں کے لیے بہر حال یہ لمحہ فکریہ تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو اب ان کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس قسم کے خدشات نے جب ایوب خاں کے دل میں جگہ پالی تو ان کے اردگرد موجود ان ارکان کابینہ نے جو بھٹو سے حسد کرتے تھے ان کی حوصلہ افزائی شروع کردی۔ نتیجتاً بھٹو کے خلاف کابینہ میں ایک پریشر گروپ بن گیا۔ 8 نومبر 1965ء کو جب بھٹو نے جنگ کے خاتمے کے بعد وطن واپس آنے پر کابینہ کو اپنے دورہ امریکا کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کرنا شروع کیا تو کابینہ کے ماحول کو دیکھ کر انھیں سمجھ آ گئی کہ ان کے خلاف لاوا پکنا شروع ہوگیا ہے۔ بھٹو جانتے تھے کہ ایوب خاں کا زوال اب قریب ہے کیوں کہ اپوزیشن ان کے خلاف دوبارہ منصوبہ بندی میں مصروف تھی جب کہ امریکا نے پاکستان میں نئے ممبروں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ ایوب خاں کی 14 دسمبر 1965ء کو امریکا میں صدر جانسان سے ملاقات ہوئی۔ ذوالفقار علی بھٹو بھی اس موقع پر موجود تھے امریکی صدر نے ایوب خاں کو تجویز دی کہ وہ

www.bhutto.org

4 جنوری 1965ء کو تاشقند میں ہونے والی امن کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ اگرچہ ایوب خاں نے بھارتی وزیراعظم شاستری سے تاشقند میں مذاکرات کے دوران ذوالفقار علی بھٹو کو اپنے ساتھ رکھا لیکن وہ کئی مواقع پر بھٹو کو کمرہ ملاقات سے باہر نکال دیتے تھے جو اس بات کا ثبوت تھا کہ ایوب خاں اب بھٹو کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ بھٹو کی خواہش تھی کہ وہ شاستری کے ساتھ ہونے والے مذاکرات میں شرکت کریں لیکن مسلسل نظر انداز کیے جانے کے باعث وہ سمجھ گئے کہ ایوب خاں ان سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے پاس اب بہترین موقع تھا کہ وہ ڈوبتی ہوئی کشتی میں بیٹھ کر ہلاک ہونے کے بجائے چھلانگ لگا دیں۔ اس لیے جب ایوب خاں نے 10 جنوری 1966ء کو معاہدہ تاشقند پر دستخط کیے تو بھٹو نے معاہدہ تاشقند کو تنقید کا نشانہ بنایا لیکن ان کی یہ تنقید زیادہ تر کابینہ کے اجلاسوں تک محدود رہی۔ معاہدہ تاشقند کے بعد ایوب خاں نے لاڑکانہ میں بھٹو کے ساتھ شکار کھیلنے کے بجائے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت جتوئی کے ڈیرے پر شکار کھیلا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اس سے سمجھ آ گئی کہ ایوب خاں اگلے مرحلے میں انھیں نالائق وزیر خارجہ ثابت کر کے کابینہ سے نکال دیں گے۔ یہ بڑی نازک صورت حالات تھی کیوں کہ ایوب خاں کے اشارے پر ان کی مسلم لیگ کے ارکان نے بھٹو کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ بھٹو کے پاس دو راستے تھے۔ اوّل یہ کہ وہ قومی اسمبلی میں معاہدہ تاشقند کے حق میں تقریر کرتے۔ دوم یا وہ استعفیٰ دے دیتے۔ بھٹو کو معاہدہ تاشقند کے حق میں تقریر کرنے کے لیے 6 دن کی مہلت دی گئی اور اس مہلت کے گزرنے کے بعد ایوب خاں نے شریف الدین پیرزادہ کو وزیر خارجہ بنا دیا اور یوں ذوالفقار علی بھٹو نے پہلی مرتبہ عوام کو آگاہ کیا کہ ایوب خاں نے معاہدہ تاشقند پر دستخط کر کے قوم سے غداری کی ہے، نتیجتاً لوگ ایوب خاں کے خلاف ہونا شروع ہو گئے اور بھٹو نے نوجوانوں، مزدوروں اور طالب علموں کے علاوہ وکلاء سے رابطے شروع کر دیے۔ ایوب خاں کو منظر عام سے ہٹانے کے لیے امریکا بھی میدان میں موجود تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایوب خاں کی مقبولیت میں کمی ہوتی چلی گئی اور جب کہ بھٹو مقبولیت کی منازل طے کرتے چلے گئے۔

www.bhutto.org

پیپلز پارٹی کا قیام اور بھٹو کا اندازِ سیاست

1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان جس سرد جنگ کا آغاز ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ شخصی تنازعے میں تبدیل ہوگئی۔ بھٹو نے بطور وزیر خارجہ مسئلہ کشمیر اور ایٹمی پروگرام پر جس قسم کا انداز اپنا رکھا تھا وہ بھارت، روس اور امریکا کے لیے خصوصی طور پر باعث تشویش تھا۔ اس لیے بھٹو جب ایک مرتبہ 23 نومبر 1965ء کو ماسکو کے سرکاری دورے پر گئے تو روس نے نہ صرف پاکستان کو 10 کروڑ روپے امداد دینے کا اعلان کیا بلکہ اس موقع پر روسی حکومت نے بھٹو کے ذریعے فیلڈ مارشل ایوب خاں کو یہ پیشکش بھی کی کہ وہ بھارتی وزیر اعظم شاستری کے ساتھ تاشقند میں ان کے مذاکرات کروانے کے لیے تیار ہیں۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں خود بھی 1965ء کی جنگ کے بعد بھارت سے بامقصد مذاکرات کے خواہش مند تھے اس لیے پاکستان نے بھارت کے ساتھ مذاکرات کے لیے روس کی مصالحتی پیشکش منظور کرلی۔ ذوالفقار علی بھٹو کو اس بات کا یقین تھا کہ پاک بھارت تعلقات اور خطے میں قیام امن کو مسئلہ کشمیر کے ساتھ منسلک کرنے کے بعد پاکستان کشمیریوں کو برس ہا برس کے مظالم سے نجات دلوانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وزارت خارجہ نے بھٹو کی قیادت میں تاشقند میں 4 جنوری 1966ء کو ہونے والے مذاکرات کو کامیاب بنانے کے لیے دن رات مختلف تجاویز پر غور کیا اور آخر کار جب پاکستانی وفد فیلڈ مارشل ایوب خاں کی قیادت میں ماسکو روانہ ہوا تو بھٹو کے بریف کیس میں مسئلہ کشمیر کے حل کے لیے کئی قابل عمل تجاویز موجود تھیں۔ تاشقند میں بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری اور ذوالفقار علی بھٹو کے درمیان 5 جنوری 1966ء کی شام بھارتی وزیر خارجہ سوران سنگھ کی موجودگی میں گرما گرمی ہوئی جسے بمشکل اخبارات سے چھپایا

www.bhutto.org

گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے دوٹوک اور غیر لچکدار موقف اختیار کرتے ہوئے اس بات پر اصرار کیا کہ بھارت پاکستان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرنے سے پہلے مسئلہ کشمیر طے کرے کیوں کہ ''پاکستان اور بھارت کے درمیان تنازعات کا بنیادی سبب مسئلہ کشمیر ہے اور جب تک یہ مسئلہ حل طلب رہے گا خطے میں امن کا قیام ممکن نہیں۔''

روسی حکام کو 5 جنوری 1966ء کی شام ہی پتا چل گیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے باعث پاک بھارت مذاکرات کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر ختم ہونے والے ہیں تو روس کے وزیر خارجہ نے پہلے فیلڈ مارشل ایوب خاں اور پھر لال بہادر شاستری سے ملاقات کی۔ روسی وزیر خارجہ گورمیکو کی شٹل ڈپلومیسی کے بعد اچانک بھٹو کو مذاکرات سے الگ کر دیا گیا۔ لال بہادر شاستری اور فیلڈ مارشل ایوب خاں کے درمیان مذاکرات کے وقت اس بات کا خصوصی طور پر اہتمام کیا گیا کہ بھٹو کمرۂ مذاکرات کے قریب تو موجود رہیں لیکن وہ مذاکرات میں حصہ نہ لے سکیں۔ بھٹو نے اس صورت حالات پر ایک دن تو خاموشی اختیار کی لیکن دوسرے دن وہ ایوب خاں کے ساتھ الجھ پڑے اور انھوں نے کہا کہ پاکستان مذاکرات کے دوران بھارت کو اس بات پر راضی کرے کہ کشمیریوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لیے حق خود ارادیت دیا جائے گا، لیکن بھٹو کی ایک نہ چلنے دی گئی۔ 9 جنوری 1966ء کو روسی وزیراعظم کو میگن نے اپنی موجودگی میں لال بہادر شاستری اور فیلڈ مارشل ایوب خاں کو 9 نکاتی معاہدہ تاشقند پر دستخط کرنے کے لیے راضی کیا جس کے تحت تجویز پایا کہ دونوں مالک کی فوجیں بین الاقوامی سرحدوں پر واپس چلی جائیں گی، پاکستان اور بھارت کے درمیان سفارتی تعلقات بحال ہو جائیں گے اور دونوں ممالک فروغ تجارت، پروپیگنڈہ کا خاتمہ، ذرائع مواصلات کی توسیع اور بے گھر افراد کی آبادکاری کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔ لال بہادر شاستری نے 10 جنوری 1966ء کو ایوب خاں کی موجودگی میں معاہدہ تاشقند پر دستخط کیے اور اسی خوشی میں وہ دل کا دورہ پڑنے کے باعث انتقال کر گئے جب کہ بھٹو نے 15 جنوری 1966ء کو کہا کہ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہم تاشقند میں مسئلہ کشمیر کا فوری حل تلاش نہیں کر سکے۔ گویا بھٹو کی طرف سے ایوب خاں پر تنقید کا یہ آغاز تھا۔ اس کے بعد انھوں نے 9 فروری 1966ء کو ذرا کھل کر کہا کہ اعلان تاشقند کو تصفیہ کشمیر کا متبادل حل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ''میں اعلان کرتا ہوں کہ کشمیریوں کو آزادی

www.bhutto.org

دلانے کے لیے ان سے متعلق میرے وعدے پورے ہوں گے۔'' 11 مارچ 1966ء کو بھٹو نے کہا کہ معاہدہ تاشقند کوئی معاہدہ ہے ہی نہیں بلکہ ''میں تو اسے صرف ایک اخلاقی سمجھوتہ سمجھتا ہوں۔ فیلڈ مارشل ایوب خاں نے معاہدہ تاشقند کرتے وقت ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو کو کابینہ سے نکال دیں گے لیکن عوامی ردعمل کے خوف کے باعث وہ ایسا نہ کر سکے۔ تاہم انھوں نے بھٹو کو ایوان صدر بلا کر کہا کہ اگر تم نے کابینہ میں رہنا ہے تو مجھ پر تنقید کا سلسلہ فوراً بند کر دو۔ بھٹو ے ایوب خاں کی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے 30 مئی 1966ء کو کہا کہ ''اب وقت آ گیا کہ حکومت قوم کو اصل صورت حالات سے آگاہ کرے، میں اب زیادہ دیر تک خاموش نہیں رہ سکتا۔'' فیلڈ مارشل ایوب خاں کا اب پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا اس لیے انھوں نے 18 جون 1966ء کو اعلان کیا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو علالت کی وجہ سے طویل رخصت پر بھیج دیا گیا ہے۔ بھٹو نے حکمت کے اس فیصلے کے بعد ایوب خاں کو اپنا استعفیٰ بھیج دیا کیوں کہ جس وقت وہ شکار کھیلنے کے لیے تیاری کر رہے تھے، ایوب خاں انھیں علیل ثابت کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ کابینہ سے الگ ہونے کے بعد بھٹو 22 جون 1966ء کو لاہور پہنچے جہاں ریلوے سٹیشن پر ان کا فقید المثال استقبال ہوا۔

عوام نے بھٹو کو جس محبت سے نوازا اسے دیکھتے ہوئے انھوں نے ایک نئی سیاسی جماعت بنانے کے لیے حکمت عملی مرتب کرنا شروع کر دی جس کے تحت پہلے مرحلے میں انھوں نے 27 فروری 1967ء کو ایوب خاں کنونشن لیگ سے خود کو علیحدہ کیا اس کے بعد انھوں نے عوامی اجتماعات سے خطاب کرنا شروع کر دیا۔ دراصل ذوالفقار علی بھٹو نئی سیاسی جماعت بنانے سے پہلے پورے ملک میں فضا کو اپنے حق میں سازگار کرنا چاہتے تھے اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب رہے۔ 30 نومبر 1967ء کو لاہور میں ڈاکٹر مبشر حسن کی گلبرگ میں واقع رہائش گاہ پر بھٹو کی موجودگی میں اہلیان وطن سے پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈالی۔ بھٹو نے تالیوں کی گونج میں پی پی پی کے تاسیسی اجلاس کی صدارت کی۔ دو دن جاری رہنے والے اس اجلاس میں بھٹو کو پارٹی کا چیئرمین چن لیا گیا اور فیصلہ ہوا کہ 3 دسمبر 1967ء کو لاہور میں ایک جلسہ عام منعقد کر کے فیلڈ مارشل ایوب خاں کے خلاف احتجاجی تحریک کا آغاز کیا جائے گا لیکن حکومت نے تاریخی جلسہ گاہ موچی دروازے میں پانی چھوڑ دیا اور وہ ہر ممکن حربہ اختیار کیا گیا جس سے جلسے کو ناکام

www.bhutto.org

بنایا جاسکے۔ اس روز بھٹو نے درجنوں کارکنوں کو ہلاک ہونے سے بچانے کے لیے جلسہ منسوخ کر دیا۔ 9 دسمبر 1967ء کو بھٹو نے 70 کلفٹن پر پریس کانفرنس کے دوران پارٹی کا 72 صفحات پر مشتمل منشور جاری کیا۔ اگرچہ حکومت نے مسلسل یہ کوشش کی کہ کسی طرح بھٹو اپنی طاقت کا مظاہرہ نہ کرسکیں لیکن اس کے باوجود 25 جنوری 1968ء کو بھٹو نے موچی دروازے میں شدید سردی کے باوجود ایک تاریخی جلسہ عام سے خطاب کیا۔ یہ دراصل رابطہ عوام کا آغاز تھا۔ غلام مصطفیٰ کھر اور ممتاز بھٹو نے کنونشن لیگ میں ہونے کے باوجود ذوالفقار علی بھٹو کے جلسوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا جس پر پارٹی نے انھیں اظہار وجوہ کے نوٹس جاری کیے اور آخر کار ممتاز بھٹو اور غلام مصطفیٰ کھر پی پی پی میں آ گئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کو ایوب خاں کے خلاف میدان میں اترا دیکھ کر دیگر اپوزیشن جماعتوں نے ایک نیا سیاسی اتحاد بنا لیا۔ ملک بھر میں مظاہرے روز مرہ کا معمول بن کر رہ گئے، خصوصاً طلبا نے بھٹو کا خوب ساتھ دیا۔ مظاہروں میں جب بہت زیادہ شدت آ گئی تو 13 نومبر 1968ء کی شب پولیس نے ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر داخل ہو کر ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کرلیا۔ اسی رات غلام مصطفیٰ کھر، ولی خان اور ممتاز بھٹو کو بھی گرفتار کیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے اپنے شوہر کی گرفتاری کو چیلنج کر دیا۔ ہائی کورٹ میں نصرت بھٹو کی رٹ پٹیشن کو تین ماہ تک لٹکائے رکھا گیا اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ بیگم صاحبہ کی درخواست پر فیصلے میں زیادہ سے زیادہ تاخیر ہو جائے۔ چوں کہ سیاستدانوں کی گرفتاری کے باوجود ایوب خاں حالات کنٹرول کرنے میں ناکام ہو گئے تھے اس لیے مجبوراً بھٹو کو 12 فروری 1969ء کو رہا کر کے لاڑکانہ میں ان کی رہائش گاہ پر نظر بند کر دیا گیا جس پر بھٹو نے 14 فروری 1969ء کو بھوک ہڑتال کر دی۔ آخر کار حکومت نے بھٹو کے مطالبے پر بے گناہ کارکنوں کو رہا کرنے کا اعلان کر دیا اور ڈیفنس آف پاکستان رولز ختم ہونے پر بھٹو نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔ 18 فروری 1969ء کو بھٹو نے کراچی میں مزار قائد اعظمؒ پر ایک بڑے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے ایوب خاں کو مشورہ دیا کہ وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر سیاست اور حکومت سے الگ ہو جائیں۔ کراچی سے بھٹو ڈھاکہ گئے جہاں وہ مولانا بھاشانی اور شیخ مجیب الرحمٰن کو ملے۔ ایوب خاں نے عوامی دباؤ کے باعث آخر کار سیاستدانوں سے مذاکرات کا فیصلہ کرلیا۔ تاہم 26 فروری 1969ء کو ہونے والی اس گول میز کانفرنس میں بھٹو شریک نہ ہوئے کیوں کہ ان کا مطالبہ تھا

www.bhutto.org

کہ گول میز کانفرنس سے پہلے اخبارات کے خلاف کالے قوانین ختم کیے جائیں۔ تمام سیاسی نظر بند رہا کیے جائیں، عوام پر تشدد ختم کیا جائے، پریسٹرسٹ ٹور دیا جائے اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہِ راست انتخابات کے ذریعے قومی اسمبلی معرض وجود میں لانے کا اعلان کیا جائے۔ جس وقت اپوزیشن جماعتیں ایوب خاں سے مذاکرات کر رہی تھیں، بھٹو راولپنڈی لیاقت باغ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے مطالبہ کر رہے تھے کہ ''گول میز کانفرنس منعقد کرنے کے بجائے ایوب خاں مستعفی ہو جائیں اور اقتدار قومی اسمبلی کے سپیکر کے حوالے کر دیا جائے جو 6 ماہ کے اندر نئے انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنائے۔''

اگرچہ فروری 1969ء میں سیاستدانوں کی اکثریت نے ذوالفقار علی بھٹو کے موقف سے اتفاق نہ کیا اور وہ اپنے مطالبات منوانے کے لیے گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے آمادہ ہو گئے۔ تاہم بھٹو کو یقین تھا کہ ایوب خاں عین وقت پر کوئی نہ کوئی چال ضرور چلیں گے جس کے باعث جمہوریت کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے 7 مارچ 1969ء کو لاہور میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے والے آج خوش ہیں کہ ایوب خاں ان کے مطالبات تسلیم کر کے از سرِ نو انتخابات کرانے کے لیے تیار ہو گئے ہیں لیکن یہ لوگ اس وقت پچھتائیں گے جب یہی ایوب خاں انھیں بے وقوف بنا کر اقتدار کسی اور کے حوالے کر دے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے اندازے درست ثابت ہوئے کیوں کہ 10 مارچ 1969ء کو جب گول میز کانفرنس دوبارہ شروع ہوئی تو فوج مارشل لاء لگانے کی تیاریاں مکمل کر چکی تھی اور 25 مارچ 1969ء کو یحییٰ خاں نے ایوب خاں کے کہنے پر مارشل لاء لگا کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور سیاستدانوں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ یحییٰ خاں نے 4 ماہ بعد سیاستدانوں کو محدود سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی اجازت دے دی۔ بھٹو نے 13 نومبر 1969ء کو رابطہ عوام مہم شروع کی اور اپنی پارٹی کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں چاہوں گا کہ نئے انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منعقد ہوں، ملک میں پارلیمانی نظام بحال کیا جائے، ون یونٹ کا خاتمہ ہو اور تمام صوبوں کو آبادی کی بنیاد پر قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں نشستیں دی جائیں۔ 28 نومبر 1969ء کو جب بھٹو پنجاب کے دورے پر بہاولپور سے ملتان آ رہے تھے تو صادق آباد میں ایک ٹرک نے انھیں ٹکر مار کر ہلاک کرنے کی کوشش کی مگر غلام مصطفیٰ کھر

www.bhutto.org

کی ہوشیاری کے باعث بھٹو پر ہونے والا یہ قاتلانہ حملہ ناکام ہو گیا اور کھر نے ایسی پھرتی سے کار کو نکالا کہ ٹرک ڈرائیور بھی دیکھتا رہ گیا۔ اسی روز یحییٰ خاں نے انتخابات کے لیے 5/اکتوبر 1970ء کی تاریخ مقرر کردی جب کہ یکم جنوری 1970ء کو یحییٰ خاں کے حکم پر سیاسی سرگرمیوں پر عاید پابندی ختم کر دی گئی۔

www.bhutto.org

بھٹو، عوام کی ضرورتوں کو سمجھتے تھے، بے نظیر بھٹو

میرے والد نے عوام کو بیداری اور سیاسی شعور دیا

پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت پاکستان کی سیاسی تاریخ میں افسانوی کردار کی حامل ہے اور کوئی بھی سیاسی بحث ذوالفقار علی بھٹو کے تذکرے کے بغیر ادھوری محسوس ہوتی ہے میں جب بھٹو صاحب کی شخصیت پر کتاب تیار کرنے لگا تو سوچا کیوں نا ان کی بیٹی اور سابق وزیراعظم بے نظیر بھٹو صاحبہ سے ان کے والد کے حوالے سے گفتگو کی جائے کہ انھوں نے اپنے والد کو کیسا لیڈر پایا۔

سوال: ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت کے بارے میں آپ کیا کہیں گی۔

بے نظیر بھٹو: میرے والد ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کے سب سے پہلے منتخب وزیراعظم تھے۔ انھوں نے عوام کو بیدار کیا اور ان کو سیاسی شعور دیا۔ پاکستان میں صنعتی ترقی کو فروغ دیا اور اعلیٰ اور جدید تعلیمی ادارے بنائے جن میں غریبوں اور امیروں کی تفریق کے بغیر تعلیم دی جانے لگی۔ قائد عوام نے بڑی ہمت کے ساتھ پاکستان کو اس وقت سنبھالا جب پاکستان دولخت ہو چکا تھا اور باقی پاکستان کے بارے میں لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ بھی نہیں بچے گا انھوں نے عوام کی طاقت کو ملا کر پاکستان کو بچایا اور ترقی کے راستے پر گامزن کیا۔ قائد عوام کا ایک ہی نعرہ تھا کہ ''چاہتا ہے ہر انسان، روٹی کپڑا اور مکان'' کیوں کہ وہ عوام کو اور ان کی ضرورتوں کو سمجھتے اور جانتے تھے۔

سوال: آپ بھٹو صاحب کے سیاسی وژن کو کس طرح دیکھتی ہیں، کیا آج وہ وژن مس

www.bhutto.org

فٹ ہے؟

بے نظیر بھٹو: بھٹو صاحب کا وژن آج بھی پاکستان کے لیے مشعل راہ ہے، وہ پاکستان کو جدت دینا چاہتے تھے اور ایک جدید، ترقی یافتہ اور فلاحی ریاست بنانے کے خواہش مند تھے، وہ چاہتے تھے یہاں استحصالی اور جاگیردارانہ نظام ختم ہو اور غریب عوام کو ان کا حق ملے۔

سوال: بھٹو صاحب غریبوں کے ہم درد اور جاگیرداری کے خلاف تھے، لیکن انھوں نے دوسرے ہی الیکشن میں جاگیرداروں کو اپنی پارٹی میں شامل کرلیا۔

بے نظیر بھٹو: ہمارا ایک منشور ہے، ہم یہ نہیں دیکھتے کہ لوگوں کا اقتصادی اور معاشی پس منظر کیا ہے، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کیا عوام کے لیے نظریے کے لیے قربانی دے سکتے ہیں یہ ہوتا ہے اصل پس منظر، لیکن آج کوئی کہے کہ موجودہ کابینہ کا کوئی عوامی بیک گراؤنڈ ہے تو میں کہوں گی، نہیں، کیوں کہ وہ آمریت کا ساتھ دے رہے ہیں۔

سوال: بھٹو صاحب پر مشرقی پاکستان کو توڑنے کے الزامات ہیں لیکن انھوں نے کبھی الزامات کا جواب نہیں دیا، آخر کیوں؟

بے نظیر بھٹو: بھٹو صاحب نے جواب دیا، مورخینے لکھا ہے کہ مشرقی پاکستان فوجی آمریت کی وجہ سے علیحدہ ہوا۔ جب بنگالیوں پر تشدد کیا جارہا تھا اور بنگالی مر رہے تھے تو یحییٰ خان اور دوسرے جرنیل ہنس رہے تھے، مجھے دُکھ ہوتا ہے جب میں بلوچستان میں ایک اور ملٹری آپریشن دیکھتی ہوں، ہم نے سانحہ مشرقی پاکستان سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ بلوچستان کے اندر عوام پر تشدد کیا جارہا ہے اور ان کا استحصال کیا جارہا ہے اگر ہم ان پر تشدد کریں گے اور ان کا استحصال کریں گے، ان کے وسائل اور زمینوں پر قبضہ کریں گے انھیں غریب اور پس ماندہ رکھیں گے تو عوام ناراض ہوں گے اور یہ آگ باقی چھوٹے صوبوں میں بھی پھیل سکتی ہے۔

سوال: اس کا مطلب کہ آپ یہ کہتی ہیں کہ سقوط ڈھاکہ کی ذمہ داری فوج پر عاید ہوتی ہے؟

بے نظیر بھٹو: نہیں بالکل نہیں ..... یہ میں نہیں کہتی، یہ مورخین اور خود بنگالی عوام کہتے ہیں۔

www.bhutto.org

سوال: اُدھر تم اور اِدھر ہم کا نعرہ نشتر پارک کراچی میں کس نے لگایا تھا؟

بے نظیر بھٹو: یہ غلط بات ہے بھٹو صاحب نے یہ نہیں کہا تھا، بلکہ انھوں نے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں تم الیکشن جیتے ہو اور مغربی پاکستان میں ہم الیکشن جیتے ہیں، لیکن جماعت اسلامی کے ایک اخبار نے یہ سرخی جمائی اور بھٹو صاحب کے الفاظ کو غلط رنگ اور معانی دیے اور بھٹو صاحب نے اس کی زبردست تردید کی تھی، لیکن آپ مجھے بتائیں کہ اگر بھٹو صاحب نے مشرقی پاکستان توڑا تھا تو بنگالی یہ کیوں نہیں کہتے کہ علیحدگی کا ذمہ دار بھٹو ہے اور اپنی کتابوں اور تاریخ میں یہ کیوں لکھتے ہیں کہ ان کے ساتھ زیادتی فوج نے کی تھی۔

سوال: انھوں نے یہ نہیں کہا تھا تو پاکستان میں نئی نسل کو حقائق سے دور کیوں رکھا گیا اور بھٹو نے حمود الرحمان کمیشن رپورٹ کیوں نہیں شائع ہونے دی؟

بے نظیر بھٹو: آپ ٹھیک کہتے ہیں یہ رپورٹ بالکل شائع ہونی چاہیے تھی اور بھٹو صاحب بھی اسے شائع کرنا چاہتے تھے لیکن فوجی جرنیل بھٹو کے پاس آئے اور انھوں نے کہا کہ یہ رپورٹ شائع نہ کی جائے اس سے فوج کی بڑی بے عزتی اور بدنامی ہوگی۔ اس لیے رپورٹ شائع نہیں کی گئی اور جب ہم سقوط ڈھاکہ اور ہتھیار ڈالنے کی تقریب ٹی وی پر دکھا رہے تھے تو تب بھی ہمیں روکا گیا تھا لیکن اب ہمیں حقائق کو سمجھنا اور جاننا ہوگا اور اب ضرورت ہے کہ حمود الرحمان کمیشن رپورٹ، سانحہ اوجڑی کیمپ سمیت جتنے بھی کمیشن ہیں ان کی رپورٹیں منظر عام پر لائی جائیں تاکہ نئی نسل ماضی کی غلطیوں سے سبق حاصل کر سکے اور مستقبل کا پاکستان محفوظ ہو سکے۔

سوال: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ پیپلز پارٹی سے بھٹو کے نظریات کو ختم کیا گیا، کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ آج کے دور میں بھٹو صاحب کے نظریات چلتے نظر نہیں آتے۔

بے نظیر بھٹو: نہیں، پیپلز پارٹی بھٹو صاحب کے اصولوں اور نظریات پر قائم ہے اور میں یہ بات نہیں مانتی، بھٹو عوامی لیڈر تھے اور مفاد پرست طبقہ عوام کے خلاف تھا۔ اس لیے وہ قائد عوام کے بھی خلاف تھے۔ بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیں گے۔ بھٹو صاحب نے عوام کے

www.bhutto.org

ساتھ بے وفائی نہیں کی اور نہ ہی عوام نے اپنے قائد کے ساتھ بے وفائی کی۔

سوال: ذوالفقار علی بھٹو عالمی سطح پر تو کامیاب لیڈر بن کر ابھرے، لیکن اندرون ملک وہ متنازع شخصیت رہے۔

بے نظیر بھٹو: یہ غلط ہے، بھٹو صاحب ایک عظیم شخصیت اور قائد عوام تھے اور وہ عوام سے اور عوام اُن سے محبت کرتے تھے بعض لوگ اس طرح کی باتیں کرتے تھے، لیکن ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

سوال: بھٹو کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا اور اس دوران آپ کی والدہ اور آپ بہن بھائیوں کے ساتھ جو کچھ ہوا اس حوالے سے آپ کچھ بتائیں۔

بے نظیر بھٹو: اس سوال کا جواب شاید میں اتنا تفصیل سے نہ بتا سکوں میرے والد کے ساتھ جو کچھ ہوا پوری دنیا جانتی ہے اور ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا میں نے اپنی خودنوشت ''مشرق کی بیٹی'' میں مکمل طور پر تحریر کیا ہے آپ اسے پڑھیں میں نے ایک ایک بات اس میں شامل کی ہے کہ کس طرح ہمارے والد کو شازش کا نشانہ بنایا گیا اور ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے۔

بے نظیر بھٹو اپنی خودنوشت ''مشرق کی بیٹی'' میں تحریر کرتی ہیں کہ راولپنڈی سنٹرل جیل میں 4/اپریل 1979ء کو صبح صادق سے بھی بہت پہلے راولپنڈی سنٹرل جیل میں انھوں نے میرے والد کو قتل کر دیا۔ چند میل دور سہالہ کے ایک ویران پولیس ٹریننگ کیمپ میں اپنی والدہ کے ساتھ مقید، میں نے اپنے والد کی موت کے اس لمحے کو محسوس کیا۔ ویلیم اعصاب کی مسکن گولیوں کے باوجود جو میری والدہ نے مجھے وہ کرب انگیز شب گزارنے کے لیے دی تھیں میں اپنے بستر سے گھبراہٹ کے عالم میں اٹھ بیٹھی۔ ''نہیں پاپا نہیں'' میرے رندھے ہوئے گلے میں سے چیخ نکل گئی۔ میں سرد ہوتی گئی اور موسم گرم کی حدت کی باوجود میرا جسم کپکپانے لگا، مجھے سانس لینا دوبھر ہوگیا اور میں سانس لینا بھی ''نہیں'' چاہتی تھی۔ میری والدہ اور میرے پاس ایک دوسرے کی تسلی کے لیے الفاظ بھی میسر نہیں تھے۔ تاہم وقت گزرتا گیا اور ہم بے سروسامان پولیس کوارٹروں میں سمٹی ہوئی بیٹھی رہیں۔ ہم دونوں صبح سویرے میرے والد کی میت کے ہمراہ جانے کے لیے تیار ہوگئیں۔

''میں عدت میں ہوں اور غیروں سے نہیں مل سکتی۔ تم باہر جاکر اس سے بات

www.bhutto.org

کرو۔'' میری والدہ نے جیلر کی آمد پر بیزاری سے کہا۔ انھوں نے اپنی عدت کی وجہ سے چار ماہ اور دس دن تک غیر محرموں سے الگ رہنے کے عمل کا آغاز کر دیا تھا۔

میں اٹھی اور سامنے کے ٹوٹے پھوٹے فرش والے کمرے میں چلی گئی جو ہماری بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کمرے سے کائی اور سڑاند کی بدبو آ رہی تھی۔ ''ہم وزیر اعظم کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہیں'' میں نے سامنے کھڑے خوفزدہ چھوٹے جیلر کو بتایا۔

''وہ انھیں دفنانے کے لیے پہلے ہی لے جا چکے ہیں'' اس نے کہا۔

میں نے محسوس کیا جیسے اس نے میرے سر پر لٹھ مار دی ہے۔ ''ان کے گھر والوں کے بغیر؟'' میں نے تلخی سے پوچھا ''فوجی حکومت کے جرائم پیشہ افراد کو بھی یہ علم ہے کہ میت کے ہمراہ جانا، اس کے لیے دعائے مغفرت کرنا، دفنانے سے پہلے چہرہ دیکھنا ہمارے خاندان کا مذہبی فریضہ ہے۔ ''ہم نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے درخواست بھی کی تھی.....''

''وہ انھیں لے گئے ہیں'' اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''کہاں لے گئے ہیں؟''

جیلر خاموش کھڑا رہا۔

''سب کچھ سکون سے ہو گیا'' وہ بالآخر بولا، جو کچھ بچا کھچا سامان تھا میں لے آیا ہوں۔

میرے والد کی کال کوٹھڑی کا بچا کھچا سامان ایک ایک کر کے میرے حوالے کیا۔ میرے والد کی قمیص شلوار، لمبی قمیص اور ڈھیلا پاجامہ جو انھوں نے آخری دنوں میں پہنا کیوں کہ بطور سیاسی قیدی انھوں نے سزا یافتہ مجرم کی وردی پہننے سے انکار کر دیا تھا۔ کھانے کا ٹفن بکس اگرچہ کچھ دنوں سے انھوں نے مطلقاً کچھ نہیں کھایا تھا، بستر کے کپڑے جن کی اجازت اس وقت ملی تھی جب چارپائی کے ٹوٹے ہوئے تاروں نے ان کی کمر کو چھلنی کر دیا تھا اور ان کا پانی پینے کا پیالہ۔

''ان کی انگوٹھی کہاں ہے؟'' میں نے جیلر سے استفسار کیا۔

''کیا ان کے پاس کوئی انگوٹھی تھی؟''

میں نے اسے اپنے تھیلے میں ہاتھ مارتے دیکھا اور پھر اپنی جیبوں میں، آخر کار اس نے میرے والد کی انگوٹھی میرے حوالے کر دی، جو آخری دنوں میں ان کی نحیف انگلیوں میں سے پھسل پھسل جاتی تھی۔

www.bhutto.org

''پُرسکون، ہر چیز بہت پُرسکون رہی'' وہ بڑبڑایا۔

پھانسی پُرسکون کیسے ہوسکتی ہے؟

بشیر اور ابراہیم ہمارے دو خاندانی بیرے جو حکام کی جانب سے ہمیں کھانا مہیا کرنے سے انکار کے بعد قید خانے میں ہمارے ساتھ آ گئے تھے۔ کمرے میں داخل ہوئے میرے والد کے کپڑے دیکھ کر بشیر کا رنگ فق ہوگیا۔

''یا اللہ، یا اللہ انھوں نے صاحب کو قتل کر دیا۔ انھوں نے انھیں مار دیا ہے'' وہ چلایا، اس سے قبل کہ ہم اسے روک سکتے اس نے پیٹرول کا ڈبہ اٹھایا اور اپنے کپڑوں پر انڈیل لیا تاکہ اپنے آپ کو آگ لگا لے۔

میری والدہ اسے خودسوزی سے منع کرنے کے لیے دوڑتی آئیں۔

میں حیران و ششدر کھڑی تھی اور جو کچھ انھوں نے میرے والد کے ساتھ کیا تھا اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھی اور نہ ہی یقین کرنا چاہتی تھی۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو جو عوام کے ووٹوں سے براہ راست پاکستان کے وزیراعظم منتخب ہوئے تھے اب موت کی نیند سلا دیے گئے تھے۔ جہاں پاکستان میں 1947ء سے قیام مملکت کے بعد جرنیلوں کے رحم و جبر کی حکومت رہی تھی وہاں میرے والد ہی تھے جو جمہوریت کو لے کر آئے تھے۔ جہاں لوگ صدیوں سے قبائلی سرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کے رحم و کرم پر جیتے آئے تھے۔ وہاں انھوں نے پاکستان کا پہلا آئین نافذ کر کے انھیں قانونی تحفظ اور شہری حقوق کی ضمانت دی تھی۔ جہاں لوگوں کو جرنیلوں سے نجات دلانے کے لیے تشدد اور خون ریزی کرنا پڑتی تھی، وہاں انھوں نے ملک کو شہریوں کی حکومت قائم کرنے کے لیے پارلیمانی نظام کا طریقہ کار وضع کیا اور ہر پانچ سال بعد انتخابات کی ضمانت دی۔

نہیں، یہ ممکن نہیں تھا۔ ''جیے بھٹو، جیے بھٹو'' کے نعرے لاکھوں لوگوں کی زبانوں پر تھے کیوں کہ میرے والد پاکستان کے پہلے سیاستدان تھے جو ملک کے دور افتادہ اور فراموش کردہ دیہات میں بھی غریب عوام تک پہنچے۔ جب ان کی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی نے حکومت سنبھالی تو میرے والد نے جدید اصولوں پر مبنی اپنے پروگرام کا آغاز کیا۔

☆ چند جاگیرداروں کی نسلوں سے قبضہ کی ہوئی زمین کی غریب مزارعوں میں تقسیم۔

☆ لاکھوں افراد کو جہالت سے نکال کر زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کا انتظام۔

www.bhutto.org

☆ ملک کی بڑی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینا۔
☆ کم از کم مزدوری کا تعین۔
☆ ملازمتوں کا تحفظ۔
☆ خواتین اور اقلیتوں سے امتیازی سلوک کا خاتمہ۔ ان کی حکومت چھ سال ملک کو اتھاہ تاریکی سے نکال کر روشن مستقبل کی طرف لائے مگر 5/ جولائی 1977ء کے سیاہ دن کی نمود نے اس تمام عمل کو روک دیا۔

ضیاء الحق، میرے والد کا مبینہ طور پر اطاعت گزار چیف آف آرمی سٹاف، وہ جرنیل جس نے اپنے سپاہیوں کو میرے والد کا تختہ الٹنے اور طاقت کے ذریعے ملک پر قبضہ کرنے کے لیے نصف شب کے قریب بھیجا، ضیاء الحق وہ فوجی آمر جو اپنی بندوقوں، اشک آور گیس کے گولوں اور ماشل لاء قوانین کی بھرمار کے باوجود میرے والد کے پیروکاروں کو کچلنے میں ناکام رہا اور جو موت کی کوٹھڑی کی تنہائی کے باوجود میرے والد کے ہمت اور حوصلہ کو نہ توڑ سکا۔ ضیاء الحق وہ مایوسی کا شکار جرنیل جس نے اگلے نو سال پاکستان پر سنگ دلی سے حکومت کی۔

میں چھوٹے جیلر کے سامنے بے بس کھڑی تھی اور میرے ہاتھوں میں اپنے والد کے بچے کھچے سامان کی ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی۔ اور بس۔ کولون شالیمار کے عطر کی خوشبو ان کے کپڑوں سے ابھی تک آ رہی تھی۔ میں نے ان کی قمیض کو اپنے ساتھ بھینچ لیا اور اچانک کیتھلین کینڈی یاد آ گئی جس نے ریڈ کلف میں اپنے سینیٹر والد کے قتل کے بعد اس کا لباس پہن لیا تھا۔ سیاسی اصطلاحات میں ہمارے دونوں خاندانوں میں مماثلت پائی گئی تھی۔ اب ہم میں ایک نیا اور خوفناک رشتہ مشترک ہو گیا تھا۔ اس رات اور بعد میں بہت سی راتیں میں اپنے والد کو اپنے پاس محسوس کرنے کے لیے ان کی قمیض اپنے تکیے کے نیچے رکھ کر سوتی رہی۔

میں نے اپنے آپ وک خلاء میں محسوس کیا، میری زندگی بالکل ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ تقریباً دو برس تک میں نے فوجی حکومت کی طرف سے اپنے والد کے خلاف لگائے گئے جھوٹے اور من گھڑت الزامات کے دفاع کے سوا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر ان انتخابات کے لیے کام کرنا شروع کر دیا جن کے انعقاد کا وعدہ جنرل ضیاء نے حکومت کا تختہ الٹنے کے وقت کیا تھا اور جنہیں بعد ازاں ہماری متوقع ہت

www.bhutto.org

کے پیش نظر جنرل ضیاء نے منسوخ کر دیا تھا۔ مجھے فوجی حکومت نے چھ مرتبہ زیر حراست رکھا اور مارشل لاء حکام نے مجھے بار بار کراچی اور لاہور کی سرزمین پر قدم رکھنے سے محروم رکھا۔ یہی حال میری والدہ کا بھی تھا۔ میرے والد کے زمانہ قید میں، انھیں پی پی پی کی قائم مقام چیئر پرسن کے طور پر آٹھ مرتبہ نظر بند رکھا گیا۔ ہم نے اپنی نظر بندی کے آخری چھ ماہ سہال میں گزارے تھے اور اس سے چھ ماہ قبل راولپنڈی میں نظر بند رہی تھیں۔ لیکن گذشتہ کل تک مجھے مطلقاً یقین نہیں تھا کہ جنرل ضیاء حقیقتاً میرے والد کو قتل کرا دے گا۔

میرے چھوٹے بھائیوں کو یہ خبر کون دے گا؟ جو لندن میں اپنے سیاسی جلاوطنی کے دونوں سے اپنے والد کی سزائے موت کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ اور میری بہن صنم کو کون بتائے گا؟ جو ہارورڈ میں اپنی تعلیم کے آخری سال میں پڑھ رہی ہے، میں صنم کے بارے میں خصوصاً متفکر تھی۔ وہ تو سیاسی ذہن کی تھی بھی نہیں، تاہم ہمارے ساتھ اسے بھی اس المیے میں دھکیل دیا گیا تھا۔ کیا وہ اب تنہا رہ جائے گی؟ میں دعائیں کرتی کہ اللہ تعالیٰ میری بہن کو حوصلہ اور استقامت عطا کرے کہ وہ کوئی بے وقوفانہ حرکت نہ کر بیٹھے۔

مجھے اپنا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہوا محسوس ہوا میں کیسے زندہ رہ سکتی تھی۔ میں کس قدر تنہا ہو گئی تھی بالکل تنہا۔ ''آپ کے سہارے کے بغیر میں کیسے زندہ رہوں گی؟'' میں نے موت کی کوٹھڑی میں اپنے والد سے یہ سوال کیا تھا۔ مجھے ان سے سیاسی رہنمائی کی ضرورت تھی۔ ہارورڈ اور آکسفورڈ کی ڈگریوں کے باوجود میں سیاستدان تو نہیں تھی۔ لیکن وہ بھی کیا جواب دے سکتے تھے؟ انھوں نے بے چارگی میں اپنے کندھے جھٹکے۔

میں ایک روز قبل اپنے والد کو آخری مرتبہ ملی تھی۔ اس ملاقات کا کرب ناقابل برداشت تھا۔ کسی نے ابھی تک انھیں اطلاع نہیں دی تھی کہ اگلی صبح انھیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔

کسی نے ان متعدد عالمی رہنماؤں کو بھی اطلاع نہیں دی جنھوں نے فوجی حکومت سے سرکاری طور پر ان کی جان بخشی کی اپیل کی تھی ان میں نہ صرف جمی کارٹر، مارگریٹ تھیچر، لیونڈ بریژنیف، پوپ جان پال دوم، چیئرمین ہوا کوفنگ اور اندرا گاندھی شامل تھے۔ بلکہ تمام عالم اسلام یعنی سعودی عرب، ایران، ترکی، سوڈان، قطر، مصر، کویت، لیبیا، فلسطین، متحدہ عرب ..ات، شام وغیرہ کے سربراہان بھی شامل تھے۔ ضیاء حکومت کے بزدل حواریوں

www.bhutto.org

میں سے کسی کو بھی جرأت نہ ہوئی کہ علی الاعلان ملک میں میرے والد کی پھانسی کی تاریخ کا اعلان کرتے..... وہ یقیناً وزیراعظم بھٹو کی موت پر عوامی ردعمل سے خوفزدہ تھے۔ صرف مجھے اور میری والدہ کو اس بات کا علم ہوا..... وہ بھی حادثتاً اور واقعات کے تجزیہ کے بعد۔

میں 2/اپریل کی صبح فوج کی طرف سے فراہم کردہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی جب میری والدہ اچانک کمرے میں داخل ہوئی۔ انھوں نے میرے گھریلو نام سے پکارا ''پنکی'' یہ ایسا لہجہ تھا کہ میرا تمام جسم اکڑ گیا۔ ''باہر فوجی افسران کا کہنا ہے کہ ہم دونوں آج تمہارے والد سے ملاقات کرلیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟''

مجھے مکمل فہم تھا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ اسی طرح میری والدہ بھی جانتی تھیں۔ لیکن ہم دونوں اس بات کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ یہ دن عمومی طور پر میری والدہ کے ملاقات کا دن تھا انھیں ہفتے میں ایک بار ملنے کی اجازت تھی۔ میری ملاقات ہفتے کے آخر میں متعین تھی۔ اب وہ ہم دونوں کو اکٹھے ملاقات کے لیے جانے کو کہہ رہے تھے اس کا مطلب تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ ضیاء نے میرے والد کے قتل کا فیصلہ کرلیا تھا۔

میرا ذہن تیزی سے حرکت میں آ گیا۔ میں نے سوچا ہمیں ملک سے باہر عالمی رائے عامہ اور اپنے عوام تک یہ خبر فوراً پہنچانا چاہیے۔ وقت ہاتھوں سے نکلتا جارہا تھا کہ میں نے والدہ کو کہا کہ انھیں بتا دیں ''کہ میری طبیعت ناساز ہے۔ البتہ اگر یہ آخری ملاقات ہے تو میں جانے کے لیے تیار ہوں'' جب میری والدہ گارڈز کے ساتھ بات کرنے کے لیے گئی میں نے جلدی میں پہلے سے تحریر شدہ پیغام لفافے میں سے نکالا اور نیا تحریر کردیا۔ میں نے جلدی جلدی اپنی دوست کے لیے ایک نیا پیغام رقم کیا ''میرا خیال ہے کہ وہ ہمیں آخری ملاقات کے لیے لے جارہے ہیں تم فوراً غیر ملکی سفیروں تک یہ پیغام پہنچاؤ۔ اس کے ساتھ ساتھ عوام کو متحرک کرو کہ وہی ہماری آخری اُمید ہیں۔''

''فوراً یہ لفافہ یاسمین تک لے جاؤ'' میں نے اپنے وفادار ملازم ابراہیم کو بتایا یہ جانتے ہوئے کہ میں ایک خطرہ مول لے رہی ہوں۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کسی ایسے پہرہ دار کی ڈیوٹی کا انتظار کرتا جو طبعاً سست ہو یا ہمارا ہمدرد بھی۔ اس کی تلاشی کا امکان تھا اور اس کا تعاقب بھی کیا جاسکتا تھا۔ وہ پوری طرح احتیاطی تدابیر شاید اختیار نہ کرسکے۔ خطرہ تو تھا مگر اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ ''ابراہیم جاؤ'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''پہرہ

www.bhutto.org

داروں کو بتاؤ تم میرے لیے دوائی لینے جا رہے ہو۔'' وہ فوراً بھاگ کھڑا ہوا، میں نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا اور دیکھا کہ مارشل لاء کے اہلکار آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ وائرلیس سیٹ پر انھوں نے پیغام ارسال کیا کہ ''میری طبیعت ناساز ہے اور میں نہیں جاسکتی۔'' اب انھیں حکام کے حکم کا انتظار تھا۔ اس افراتفری میں ابراہیم گیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ ''مجھے بے نظیر صاحبہ کے لیے دوائی لینا ہے'' پہرہ دار جو میری ناساز طبع کے متعلق سن چکے تھے انھوں نے ابراہیم کو نہیں روکا اور وہ معجزانہ طور پر باہر نکل گیا۔ چند منٹ بعد میری والدہ میرے کمرے کے اندر آ گئی۔ میرے ہاتھ مسلسل کپکپا رہے تھے مجھے یقین نہیں کہ میرا پیغام یاسمین تک پہنچ جائے گا۔

دریچے سے باہر وائرلیس سیٹ کھڑکھڑا اٹھے حکام نے میری والدہ کو بتایا کہ چوں کہ ان کی بیٹی کی طبیعت ناساز ہے اس لیے دونوں کی ملاقات اگلے روز ہوگی۔ ہمیں اب اپنے والد کی جان بچانے کے لیے مزید 24 گھنٹے مل گئے تھے۔ ابراہیم کے باہر جانے کے بعد صحن کے بڑے دروازے فوراً بند کر دیے گئے اور ہمیں کسی بُری خبر کا منتظر ہونا پڑا۔

لڑنا ہے ہمیں بہرصورت والد کی زندگی بچانے کی جنگ لڑنا ہے، مگر کیسے؟ ان کی زندگی کے لمحات دھیرے دھیرے کم ہو رہے تھے۔ اس کا بھی ہمیں احساس تھا، کیا ہمارا پیغام مل چکا ہوگا؟ کیا لوگ بندوقوں اور سنگینوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے؟ جن کا اب تک وہ مقابلہ بے جگری سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی رہنمائی کون کرے گا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے لیڈروں کی اکثریت جیلوں میں قید تھی اسی طرح عوام الناس میں ہمارے ہمدرد بھی جیلوں میں بند تھے اور ان میں پہلی دفعہ کثیر تعداد عورتوں کی بھی شامل تھی۔ لاتعداد لوگ آنسو گیس کا شکار ہوئے انھوں نے کوڑے کھائے صرف اس بات پر کہ انھوں نے میرے والد کا نام بلند آواز سے پکارا تھا۔ ان کے نیم برہنہ جسموں پر کوڑوں کے نشان اب تک ثبت ہیں۔ کیا لوگ ہماری آخری آواز پر لبیک کہیں گے؟ کیا یہ آواز ان تک پہنچ بھی سکے گی؟

سوا آٹھ بجے شب میں نے اور میری والدہ نے بی بی سی کی ایشیاء رپورٹ سننے کے لیے ریڈیو آن کیا۔ میرے جسم کا ریشہ ریشہ اکڑ چکا تھا۔ میں متوقع خبر سننے کے لیے متوجہ ہوئی جب بی بی سی نے رپورٹ دی کہ میں نے حراست سے ایک پیغام ارسال کیا ہے کہ کل مورخہ 4 اپریل کو والد کے ساتھ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔ پیغام تو نشر ہوا لیکن عوام

www.bhutto.org

الناس کو احتجاج میں اٹھنے کی جو کال ہم نے دی تھی وہ بی بی سی کے اعلان نامہ مقصود تھی۔ اس کے برعکس بی بی سی نے رپورٹ کیا کہ اس خبر کی کوئی تصدیق جیل سپرنٹنڈنٹ سے نہیں ہوئی بلکہ میرے والد ہی کے ایک سابق وزیر کا حوالہ دیا گیا جس میں کہا گیا۔ ''وہ بلاوجہ تشویش میں مبتلا ہوگئی ہے۔'' میری والدہ اور مجھ میں ایک دوسرے کو دیکھنے کی بھی سکت نہ رہی۔ ہماری آخری امید گل ہوگئی۔ اگلے روز ایک تیز رفتار جیپ میں ہمیں جیل پہنچا دیا گیا۔ حفاظتی افواج کے پیچھے خوف زدہ لوگوں کا ہجوم تھا جنہیں اپنے وزیراعظم کی قسمت کے متعلق کوئی خبر نہیں، جیل کی میٹرن نے میری والدہ اور میری تلاشی لی، ایک مرتبہ جب ہم سہالہ کے قید خانہ سے روانہ ہوئیں اور دوسری مرتبہ جب ہم راولپنڈی سنٹرل جیل پہنچیں۔

''آج تم دونوں اکٹھی یہاں کیوں آئی ہو؟'' میرے والد نے اپنی کال کوٹھڑی کی دوزخ سے آواز دی۔

میری والدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''کیا یہ آخری ملاقات ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

میری والدہ جواب دینے کا ارادہ نہیں رکھتیں۔

''میرا خیال ہے ایسا ہی ہے'' میں نے جواب دیا۔

وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو پاس ہی کھڑا ہے (یہ لوگ ہمیں پاپا کے ساتھ تنہا چھوڑنے پر کبھی تیار نہیں ہوئے)۔

''کیا یہ آخری ملاقات ہے؟'' میرے والد اسے پوچھتے ہیں۔

''ہاں'' جواب میں جیلر کہتا ہے جیل سپرنٹنڈنٹ حکومت کا یہ پیغام دیتے ہوئے شرمسار محسوس ہوتا ہے۔

''کیا تاریخ کا تعین ہوگیا ہے؟''

''کل صبح'' جیل سپرنٹنڈنٹ کا جواب ہے۔

''کتنے بجے؟''

''جیل قواعد کے مطابق صبح پانچ بجے۔''

''یہ اطلاع تمہیں کب ملی؟''

''کل رات'' اس نے رکتے رکتے جواب دیا۔

www.bhutto.org

میرے والد اسے نظر بھر کے دیکھتے ہیں۔

''اپنے اہل وعیال سے ملاقات کا کتنا وقت دیا گیا ہے۔''

''نصف گھنٹہ''

''جیل قواعد کے مطابق ہمیں ایک گھنٹہ ملاقات کا حق ہے۔'' وہ کہتے ہیں۔

''صرف نصف گھنٹہ'' سپرنٹنڈنٹ دہراتا ہے۔ ''یہ میرے احکامات ہیں۔''

''غسل اور شیو کرنے کے لیے انتظامات کرو۔'' میرے والد اسے کہتے ہیں۔ ''دنیا خوبصورت ہے اسے میں اسی حالت میں الوداع کہنا چاہتا ہوں۔''

''صرف نصف گھنٹہ'' اس شخص سے ملاقات کے لیے..... صرف نصف گھنٹہ جو مجھے زندگی کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے سینے میں درد سے گھٹن محسوس ہوتی ہے مجھے رونا نہیں چاہئے مجھے اپنے ہوش بھی نہیں کھونے چاہئیں کیوں کہ اس طرح میرے والد کی اذیت بڑھ جائے گی۔

وہ فرش پر پڑے گدے پر بیٹھے ہوئے ہیں ان کی کوٹھڑی میں اب صرف یہی فرنیچر باقی رہ گیا ہے جیل حکام کرسی اور میز لے جاچکے ہیں چارپائی بھی وہاں سے اٹھائی جاچکی ہے میگزین اور کتابیں جو میں پاپا کے لیے لاتی رہی تھی وہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ ''انھیں لے جاؤ میں نہیں چاہتا یہ لوگ میری کسی چیز کو ہاتھ لگائیں۔''

وہ چند سگار جو ان کے وکلاء وہاں چھوڑ گئے تھے میرے حوالے کرتے ہیں..... میں آج شب کے لیے صرف ایک رکھ لیتا ہوں۔ شالیمار کولون کی شیشی بھی رکھ لیتے ہیں۔ وہ اپنی انگوٹھی بھی مجھے دینا چاہتے ہیں لیکن میری والدہ انھیں کہتی ہیں ''اسے پہنے رکھیں'' وہ کہتے ہیں ''اچھا ابھی میں رکھ لیتا ہوں لیکن بعد میں بے نظیر کے حوالے کردی جائے۔''

''میں نے ایک پیغام باہر کی دنیا تک پہنچا دیا ہے'' میں نے بہت آہستہ سے انھیں بتایا (جیل کے حکام میری آواز سننے کی کوشش کرتے ہیں)

میں تفصیلات بتاتی ہوں وہ اطمینان محسوس کرتے ہیں ''یہ سیاست کے اسرار ورموز میں ماہر ہو چکی ہے'' ان کے چہرے کے تاثرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ موت کی کوٹھڑی میں روشنی مدھم سی ہے میں انھیں صاف طور پر نہیں دیکھ سکتی۔ اس سے قبل ہر ملاقات کوٹھڑی میں ان کے پاس بیٹھ کر ہوتی رہی لیکن آج ایسا نہیں ہے۔ کوٹھڑی کے باہر دروازے کی سلاخوں

www.bhutto.org

کے ساتھ میں اور میری والدہ سکڑ کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ باتیں کھسر پھسر کے انداز میں کرتے ہیں۔ ''دوسرے بچوں کو میرا پیار دینا'' وہ میری ممی سے کہتے ہیں۔ ''میر، سنی، اور شاہ کو بتانا میں نے ہمیشہ ایک اچھا باپ بننے کی کوشش کی اور میری خواہش ہے کہ کاش انھیں بھی الوداع کہہ سکتا۔'' میری والدہ سر ہلاتی ہیں منہ سے کچھ نہیں بول سکتیں۔

''تم دونوں نے بہت تکالیف اٹھائی ہیں'' وہ کہتے ہیں ''وہ آج مجھے قتل کرنے جارہے ہیں۔ میں تمہیں تمہاری مرضی پر چھوڑتا ہوں اگر چاہو تو پاکستان سے اس وقت تک باہر چلے جاؤ جب تک آئین معطل ہے اور مارشل لاء نافذ ہے اگر تمہیں ذہنی سکون چاہئے اور زندگی نئے سرے سے گزارنا چاہتی ہو تو یورپ چلی جاؤ میری طرف سے اجازت ہے۔''

(ہمارے دل ٹوٹ رہے ہیں) ''نہیں، نہیں'' ممی کہتی ہیں۔ ''ہم نہیں جاسکتے'' ہم کبھی نہیں جائیں گے جرنیلوں کو کبھی یہ تاثر نہیں دیں گے کہ وہ جیت چکے ہیں۔ ضیاء نے انتخابات کا دوبارہ پروگرام بنایا ہے اگرچہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ ایسا کرنے کی جرأت بھی کرے گا یا نہیں..... ہم باہر چلی جائیں تو پارٹی کی رہنمائی کے لیے کوئی نہیں ہوگا اور یہ وہ پارٹی ہے جس کی آپ نے بنیاد رکھی اور پروان چڑھایا۔

''اور تم پنکی!'' میرے والد پوچھتے ہیں۔

''میں بھی کبھی نہیں جاسکتی'' میرا جواب ہے۔

وہ مسکراتے ہیں۔ ''میں بہت خوش ہوں تم نہیں جانتی مجھے تم سے کتنا پیار ہے۔''

''تم میری لعل ہو اور ہمیشہ ہی رہی ہو۔''

''وقت ختم ہو چکا'' سپرنٹنڈنٹ پکارتا ہے۔ ''وقت ختم ہو چکا۔''

میں سلاخوں کو پکڑ لیتی ہوں۔

''برائے مہربانی کوٹھڑی کا دروازہ کھول دو میں اسے کہتی ہوں میں اپنے پاپا کو الوداع کہنا چاہتی ہوں۔''

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔

میں دوبارہ التجا کرتی ہوں ''میرے والد پاکستان کے منتخب وزیراعظم ہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں یہ ہماری آخری ملاقات ہے مجھے ان سے مل لینے دو۔''

سپرنٹنڈنٹ انکار کر دیتا ہے۔

www.bhutto.org

سلاخوں کے درمیان سے میں اپنے والد کے جسم کو چھونے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ اس قدر نحیف و ناتواں ہو چکے ہیں ملیریا، پیچش اور ناکافی خوراک کھانے کی وجہ سے جسم بالکل نحیف اور باریک ہو چکا ہے۔ لیکن وہ سیدھا اُٹھ بیٹھتے ہیں اور میرے ہاتھ کو چھو لیتے ہیں۔

''آج شب علائم دنیا ہے آزاد ہو جاؤں گا'' چہرے پر ایک چمکتی روشنی لیے کہتے ہیں۔

''میں اپنی والدہ اور اپنے والد کے پاس چلا جاؤں گا۔'' میں لاڑکانہ میں اپنے اجداد کی زمینوں کی طرف واپس جا رہا ہوں تا کہ اس سرزمین کا اس کی خوشبو اور اس کی فضا کا حصہ بن جاؤں۔''

''خلق خدا میرے بارے میں گیت گائے گی میں اس کی کہانیوں کا جاوداں حصہ بن جاؤں گا۔''

وہ مسکراتے ہوئے کہتے ہیں ''لیکن لاڑکانہ میں آج کل بہت گرمی ہے۔''

''میں وہاں ایک سائبان تعمیر کردوں گی۔'' میں بمشکل کہہ سکی۔ جیل حکام آگے بڑھتے ہیں۔

''الوداع پاپا!'' میں والد کی طرف دیکھ کر پکار اٹھتی ہوں اور میری ممی سلاخوں میں سے ان کو چھو لیتی ہیں۔ ہم گرد آلود صحن میں سے گزرتے ہیں۔ میں مڑ کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں لیکن حوصلہ نہیں پڑتا۔ مجھے معلوم ہے میں ضبط نہیں کرسکوں گی۔ ''ہم جب پھر ملیں گے اس وقت تک خدا حافظ'' مجھے ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔

تاہم میں چل پڑتی ہوں۔ مجھے چلنے کا مطلق احساس نہیں ہو رہا۔ میں پتھر بن چکی ہوں جیل حکام ہمیں جیل وارڈ کے اندر واپس لے جاتے ہیں۔ صحن میں فوجیوں کے متعدد ٹینٹ ایستادہ ہیں میں مدہوشی کے عالم میں چلی جا رہی ہوں صرف اپنے سر کی موجودگی کا احساس ہے۔ سر بلند رہنا چاہئے وہ لوگ ہماری طرف متوجہ ہیں۔

مقفل دروازوں کے اندر کار ہماری منتظر ہے تا کہ باہر ہجوم ہمیں دیکھ نہ سکے۔ میرا جسم اس قدر بوجھل ہو گیا ہے کہ کار کے اندر داخل ہونا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کار دروازوں کے بیچ میں سے تیزی سے حرکت کرتی ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہجوم کے ایک سرے پر کھڑی اپنی دوست یاسمین پر اچانک میری نظر پڑتی ہے جس کے ہاتھ میں والد کے دینے کے لیے خوراک کا ٹفن کیریئر ہے۔ ''یاسمین! وہ آج رات انھیں مار دیں گے'' میں کار کے شیشوں

www.bhutto.org

میں سے چلائی۔ ''کیا اس نے میری آواز سنی؟''۔ ''کیا میں نے کوئی آواز نکالی بھی یا نہیں..... کیا کہہ سکتی ہوں؟''

صبح کے پانچ بج گئے پھر چھ بجے..... ہر سانس جو میں لیتی مجھے اپنے والد کے آخری سانسوں کی یاد دلاتا۔ ''اے خدا! کوئی معجزہ ہی رونما ہو جائے۔'' میری ماں اور میں نے دعا مانگی۔ ''کچھ نہ کچھ ہو جانا چاہئے'' میری چن چن جسے میں اپنے ساتھ قید خانے میں لے آئی تھی، وہ بھی تناؤ کو محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنے بلونگڑوں کو کہیں چھپا دیا تھا وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

ہم ناقابل یقین اُمید کے ساتھ چپکے ہوئے تھیں۔ سپریم کورٹ نے متفقہ طور پر سفارش کی تھی کہ میرے والد کی سزائے موت کو عمر قید میں بدل دیا جائے مزید براں پھانسی دیے جانے کی صورت میں پاکستانی قانون کے مطابق ایک ہفتے قبل دن اور تاریخ کا تعین اعلانیہ کر دیا جائے۔ لیکن ایسا کوئی اعلان سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔

پی پی پی کے راہنماؤں نے بھی ہمیں یہ پیغام ارسال کیا کہ ضیاء نے سعودی عرب، متحدہ امارات اور دوسرے ملکوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ میرے والد کی سزائے موت کو تبدیل کر دے گا۔ لیکن ضیاء کا ریکارڈ قانون سے بے اعتنائی اور جھوٹے مواعید سے بھرا پڑا تھا۔ ہمارے مستقل خدشات کی بدولت، جب بھی پھانسی کی حتمی تاریخ کا حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا۔ سعودی عرب کے وزیر خارجہ اور لیبیا کے وزیراعظم نے فوراً بذریعہ طیارہ پاکستان پہنچنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ ''کیا انھوں نے بی بی سی پر میرا پیغام سن لیا تھا؟ کیا ابھی بھی ان کے پاس پاکستان پہنچنے کا وقت تھا؟''

چینیوں کا ایک وفد اسلام آباد میں تھا۔ میرے والد ہی نے پاکستان چین دوستی کا آغاز کیا تھا۔ کیا وہ ضیاء کو اپنے فیصلے سے منحرف کرا سکیں گے؟

میری والدہ اور میں سہالہ کی شدید گرمی میں بے حس و حرکت اور خاموش بیٹھی تھیں۔ ضیاء نے یہ بات بھی پھیلائی تھی کہ وہ رحم کی اپیل اس وقت ہی سنے گا اگر یہ میرے والد یا ہماری طرف سے کی گئی۔ میرے والد نے ایسا کرنے کو سختی سے منع کر دیا تھا۔

موت کی جانب گنتی کے یہ لمحات کیسے گزرتے ہیں؟ میری والدہ اور میں گم سم بیٹھی تھیں۔ بعض اوقات ہم چلاتی بھی تھیں۔ جب ہم میں بیٹھنے کی سکت باقی نہ رہی تو ہم

www.bhutto.org

بستر کے تکیوں پر گر گئیں۔ وہ ان کی زندگی ختم کر دیں گے، میں متواتر سوچتی رہی۔ وہ ان کی زندگی ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ان کے اپنے احساسات اس بھرپور تنہائی میں کیسے ہوں گے۔ جب کہ ان کے پاس اس وقت کوئی بھی نہیں؟ انھوں نے اپنے پاس کوئی کتاب بھی نہیں رکھی۔ انھوں نے اپنے پاس کچھ بھی نہیں رکھا صرف ایک سگار ان کے پاس تھا۔ میری گلا گھٹن سے جکڑ گیا اور میں اسے پھاڑ کر کھول دینا چاہتی تھی۔ لیکن میں ان پہرہ داروں کو جو ہماری کھڑی کے باہر ہر وقت ہنستے اور باتیں کرتے رہتے تھے اپنی چیخوں سے اس طرح کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ ممی! میں برداشت نہیں کر سکتی بالکل نہیں کر سکتی۔ آخر میں ڈیڑھ بجے کے قریب بالکل ٹوٹ گئی وہ میرے لیے مسکن دوائی کی گولیاں لائیں۔ ''سونے کی کوشش کرو''، انھوں نے کہا۔

آدھ گھنٹے کے بعد میں اپنے بستر سے اچانک اٹھ بیٹھی..... والد کے گلے کا پھندا میں نے اپنے گلے کے ارد گرد محسوس کیا۔

آسمانوں سے اس شب برف کے آنسو برسے۔ لاڑکانہ میں ہماری خاندانی زمینوں پر اولے پڑے۔ گڑھی خدا بخش میں ہمارے آبائی قبرستان میں فوجی دستوں کی ہل چل سے لوگ جاگ اٹھے۔ جب میری والدہ اور میں اپنے قید خانے میں رات کے وقت کرب کی گھڑیاں گزار رہی تھیں میرے والد کی میت گڑھی میں دفنانے کے لیے بذریعہ طیارہ لے جائی جا رہی تھی۔ مارشل لاء انتظامیہ کی ابتدائی پارٹی نے ہمارے ایک دیہاتی نذر محمد کے ذریعہ تمام انتظامات مکمل کیے تھے۔ نذر محمد اور اس کے خاندان کے افراد ہماری زمینوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور کئی نسلوں سے ہمارے ساتھ کام کر رہے ہیں۔

نذر محمد کا بیان

میں 4/اپریل کی صبح تین بجے اپنے گھر میں سویا ہوا تھا جب میں نے گاؤں کے نواح میں پچاس سے ساٹھ فوجی گاڑیوں کی تیز روشنی دیکھی۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ شاید دو روز قبل کی طرح بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد جو عمل جاری رکھنا ہے اس کی ریہرسل کر رہے ہیں یعنی معمول کی فوجی مشقیں ہیں۔ لوگ بہت خوفزدہ تھے خاص طور پر بھٹو قبرستان میں پولیس کے داخل ہو کر ہر طرف بغور دیکھنے پر جب پولیس نے علی الصبح مجھے گھر سے باہر آنے

www.bhutto.org

کو کہا دیہات کے تمام لوگ بوڑھے اور جوان مرد اور عورتیں اپنے گھروں سے باہر نکل پڑے۔ تم کو خدشہ تھا کہ بھٹو صاحب کو یا تو پھانسی دیا جاچکا ہے یا جلدی دیا جانے والا ہے۔ ہر طرف چیخ و پکار تھی اور سب کے چہروں پر مایوسی۔

''ہمیں بھٹو صاحب کے دفنانے کا انتظام کرنا ہے۔'' لاتعداد فوجی اور پولیس نوجوانوں نے اپنے عارضی ہیڈ کوارٹر پر مجھے لاکر کہا ''ہمیں وہ جگہ دکھاؤ جہاں ہم قبر کھودیں۔'' میں رو رہا تھا۔ ''ہم تمہیں بھٹو صاحب کو دفنانے کی جگہ کی نشان دہی کیوں کریں؟'' ''ہم ان کی آخری رسومات خود ادا کریں گے بھٹو صاحب ہمارے ہیں میں نے جواب میں کہا۔''

میں نے انھیں اپنے آدمی سے قبر کھودنے کے لیے لانے کی اجازت مانگی تاکہ قبر کے لیے کچی اینٹیں اور لکڑی کے تراشے ہوئے پھٹے بھی لائے جاسکیں۔ اور مذہبی رسومات بھی ادا کی جاسکیں۔ انھوں نے مجھے صرف آٹھ آدمیوں سے مدد لینے کی اجازت دی۔

جب ہم اس اذیت ناک کام میں لگے ہوئے تھے فوجی اور پولیس گاڑیوں نے پورے گاؤں کو محاصرے میں لے لیا۔ بلکہ چھوٹی سے چھوٹی گلی میں بھی رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ نہ کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تھی اور نہ ہی باہر سے گاؤں کے اندر داخل ہونے کی۔ ہم مکمل طور پر باقی دنیا سے کٹ چکے تھے۔ آٹھ بجے صبح دو ہیلی کاپٹر گاؤں سے باہر سڑک پر اترے جہاں ایمبولینس انتظار میں کھڑی تھی میں نے کفن ایمبولینس میں منتقل ہوتے دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے قبرستان تک پہنچا۔ ''اس گھر کو خالی کردو'' فوجی کرنل نے قبرستان کے جنوبی کونے میں چھوٹی سی رہائش گاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے کہا۔ یہ پیش امام کی رہائش گاہ تھی جو اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ وہاں رہائش پذیر تھا۔ میں نے پیش امام، اس کی بیوی اور اس کے بچوں پر اس ظلم اور ناروا سوک پر احتجاج کیا مگر کرنل اپنی بات پر مصر رہا۔ 20 مسلح یونیفارم میں ملبوس جوانوں نے اس گھر کی چھت پر مورچہ سنبھال لیا اور اپنی بندوقیں قبرستان کی سمت تان لیں۔ پھر اعلان کیا گیا کہ نزدیکی رشتے دار جانے والے کا آخری دیدار کرلیں۔ بھٹو صاحب کے چچا زاد اور ماموں زاد بھی قبرستان کے نزدیک گڑھی خدا بخش میں رہتے تھے۔ بھٹو صاحب کی پہلی بیوی بھی نزدیکی دیہات نوڈیرو میں رہتی تھیں۔ کافی پس و پیش کے بعد حکام نے مجھے ان کو لانے کی اجازت دی۔ جب وہ پہنچیں تو

www.bhutto.org

ہم نے کفن کو کھولا اور میت کو رسی سے بنی ہوئی چارپائی پر منتقل کیا۔ یہ چارپائی میں اپنے گھر سے لے آیا تھا تاکہ پیش امام کے گھر میں میت کو منتقل کرتے وقت کام آسکے۔ بھٹو صاحب کی بیوی پردہ کرتی تھی اور اپنے گھر والوں کو اجنبی نظروں سے محفوظ رکھنے کے لیے باہر بے پردہ نہیں آنے دیتی تھی۔ خاندان سے باہر کسی مرد کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن فوجی جوان تہذیب وتمدن کے تمام معیاروں کو کچلتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئے۔

جب میت آدھ گھنٹے بعد گھر سے باہر لائی گئی تو میں نے کرنل سے حلفاً بتانے کے لیے کہا ''آیا میت کو مذہبی اصولوں اور روائتی رسومات کے مطابق غسل دیا گیا تھا'' کرنل نے حلفاً کہا کہ ایسا ہی کیا گیا تھا۔ میں نے مزید تسلی کے لیے کفن کا کپڑا چیک کیا تو دیکھا کہ جسم پر کفن موجود تھا۔

ہم اس قدر پریشان اور غمزدہ تھے کہ ہمیں باقی جسم کو دیکھنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ ہمیں ایسا کرنے کی اجازت دیتے کیوں کہ اس طرح ان کے اعمال شنیعہ منکشف ہو جاتے۔ تاہم ان کا چہرہ موتی کی طرح دمکتا تھا۔ وہ اتنے تازہ دم نظر آرہے تھے جیسا کہ سولہ سالہ نوجوان ہو۔ ان کی جلد جلکئی رنگوں میں بدلی ہوئی نہیں تھی۔ نہ ہی ان کی آنکھیں یا زبان باہر کو لٹکی ہوی تھیں جس طرح ان آدمیوں کی جنہیں ضیاء نے سرعام پھانسی دلوایا تھا۔ مذہبی روایات کے مطابق میں نے بھٹو صاحب کے چہرے کا رخ مغرب یعنی مکہ کی جانب کر دیا اور ان کی دن وٹی ہوئی تھی ان کے گلے پر عجیب طرح کے سرخ اور سیاہ نشان تھے جیسے کسی سرکاری مہر کے ہوتے ہیں۔ کرنل بہت ناراض ہوا۔ 1400 سے 1500 لوگ دیہات کی جانب سے آگے بڑھتے آرہے تھے اور شہید کے چہرے پر چمک کو دیکھنے کے لیے بے تاب نظر آتے تھے۔ ان کی چیخیں دلدوز تھیں۔ کرنل نے لوگوں کو منتشر نہ ہونے کی صورت میں لاٹھی چارج کی دھمکی دی۔ ''دفنانے کا عمل فوراً مکمل کیا جائے'' اس نے کہا۔ ''ضرورت پڑی تو ڈنڈے کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کریں گے۔''

''وہ غم سے چلا رہے ہیں اور ان کے دل ٹوٹ چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔

بندوقوں کے جلو میں ہم نے مرحوم کو آخری دعاؤں کے ساتھ دفن کیا۔ مرحوم کی روح کو ثواب پہنچاتے ہوئے ہم نے ان کی میت کو قبر میں اتارا۔ قرآن کی تلاوت بھی جاری تھی اور دیہات کے گھروں میں سے عورتوں کی آہ وزاری کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

www.bhutto.org

متعدد دنوں تک سہالہ میں اپنے والد کی موت کے بعد کھانا اور پینا بالکل چھوٹ گیا پانی کے دو گھونٹ پیتی اور تھوک دیتی میں کوئی چیز بھی نگلنے کے قابل نہیں تھی نیند بھی ! چکی تھی۔ ہر مرتبہ جب آنکھیں بند کرتی ایک ہی خواب دکھائی دیتا۔ ''میں ڈسٹرکٹ جیل کے سامنے کھڑی ہوں۔ دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ایک موہوم سی شکل میری طرف بڑھتی ہے پاپا! کہتے ہوئے میں اس کی طرف دوڑتی ہوں'' ''آپ آگئے ہیں آپ آگئے ہیں'' میں خیال کرتی تھی وہ آپ کو مار چکے ہیں لیکن آپ زندہ ہیں جونہی میں ان تک پہنچتی میری آنکھیں کھل جاتیں اور یہ تلخ حقیقت میرے سامنے آجاتی کہ وہ تو جا چکے ہیں۔

کچھ تو کھاؤ ''پنکی'' تمہیں کچھ نہ کچھ کھانا چاہئے۔ میری والدہ زور دے کر کہتیں اور میرے لیے سوپ لاتیں۔ ''جب ہم یہاں سے باہر جائیں گے تو انتخابات کی تیاری کے لیے تمہیں پوری توانائی کی ضرورت ہوگی۔'' تاکہ اگر تم اپنے باپ کے اصولوں کی خاطر اپنی جدوجہد جاری رکھنا چاہتی ہو اور اسیطرح لڑنا ہے جس طرح تمہارے والد لڑے تو کھاؤ۔ کچھ ضرور کھاؤ۔

تعزیت کے جو پیغامات ہمیں ملتے وہ میں پڑھنے کی پوری کوشش کرتی۔ میری ایک خاندانی دوست نے 5/اپریل کو لکھا ''میری پیاری آنٹی اور بے نظیر! میرے پاس غم و اندوہ بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں پوری قوم اس موجودہ سانحہ کی ذمہ دار ہے ہم سب مجرم ہیں۔''

''ہر پاکستانی غم زدہ ہے مایوس ہے اور غیر محفوظ ہے ہم سب گنہگار ہیں اس گناہ میں ملوث ہیں۔''

اس دن راولپنڈی کے لیاقت باغ میں دس ہزار لوگ جمع ہوئے جہاں ڈیڑھ برس قبل میری والدہ کو سننے کے لیے ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ یہ ہجوم پہلی انتخابی مہم کے موقع پر میرے مقید والد کی محبت میں جمع ہوا تھا۔ پی پی پی کے پر ہجوم جلسوں کو دیکھ کر ہی ضیاء نے انتخابات کو منسوخ کر دیا اور میرے والد کو موت کی سزا دی اب نماز جنازہ میں شریک میرے والد کے عقیدت مند ہجوم پر پولیس نے آنسو گیس پھینکی۔ لوگ بھاگے اور پولیس پر اینٹوں اور پتھروں کی بارش کر دی جس پر پولیس اپنی لاٹھیاں لے کر آگے بڑھی اور کچھ گرفتاریاں کیں۔ یاسمین، اس کی والدہ اور دو ہمشیروں نے نماز جنازہ میں شرکت کی اسی

طرح میری ایک دوست آمنہ پراچہ جس نے سپریم کورٹ میں دائر میرے والد کے مقدمہ میں وکلاء کی امداد کی، اس کی دو بہنوں، بھتیجیوں اور ستر سالہ بوڑھی آیا نے بھی جنازے میں شرکت کی۔ تمام کی تمام دس خواتین کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ ان کے علاوہ سینکڑوں دوسرے افراد بھی دو ہفتوں کے لیے قید کر دیے گئے۔

جلد ہی میرے والد کی موت کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہر طرف پھیل گئیں۔ پھانسی دینے والا جلاد پاگل ہو گیا ہ۔ میرے والد کی میت کو طیارہ میں لے جانے والے پائلٹ کو جب پتا چلا کہ میت کس کی ہے وہ اس قدر جذباتی ہو گیا کہ اس نے جہاز واپس زمین پر اتار لیا اور ایک دوسرے پائلٹ کو طیارہ چلانے کے لیے بلانا پڑا۔ اخبارات میرے والد کے خاتمے کے بارے میں بہت سی دہشت ناک تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے انھیں پھانسی سے قبل ہی اس قدر اذیت دی گئی کہ وہ تقریباً مردہ تھے جب انھیں سٹریچر پر ڈال کر تختہ دار تک لے جایا گیا۔ ایک اور بات بار بار دہرائی گئی تفصیل یہ تھی کہ ان کی کوٹھڑی میں تشدد کے ذریعے انھیں قتل کر دیا گیا تھا۔ فوجی افسران انھیں ایک اقبالی بیان پر دستخط کرنے پر مجبور کر رہے تھے، جس میں درج تھا کہ میرے والد نے اپنا تختہ الٹنے کی سازش کا خود ہی انتظام کیا تھا اور ضیاء کو ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کی خود ہی دعوت دی تھی۔ میرے والد نے فوجی حکومت قانون جواز بخشنے کے جھوٹے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اسی ضمن میں ایک روایت یہ بھی تھی کہ ایک افسر نے میرے والد کو اس قدر شدید دھکا دیا تھا کہ وہ گر گئے۔ ان کا سر کوٹھڑی کی دیوار سے اس زور سے ٹکرایا کہ وہ بے ہوش ہو گئے اور دوبارہ ہوش میں نہ آ سکے۔ ایک ڈاکٹر کو انھیں ہوش میں لانے کے لیے بلایا گیا جس نے دل کی مالش کی اور ہوش میں آنے کی ایک دوائی دی جس سے نرمحمد کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس نے ان کے گلے پر نشانات دیکھے تھے لیکن اب ان تمام باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔

تاہم میں اس کہانی کو حقیت کے قریب سمجھتی ہوں کیوں کہ میرے والد کے جسم پر پھانسی دیے جانے کے نشانات واضح نہیں تھے آخر انھیں پھانسی دیے جانے کے مقررہ وقت سے تین گھنٹے پہلے رات کے دو بجے سوتے میں اچانک میری نکھ کیوں کھل گئی تھی؟ ایک دوسرے سیاسی قیدی جنرل نصیر اللہ بابر نے مجھے بتایا کہ وہ بھی رات دو بجے ایک ٹھنڈی سی

www.bhutto.org

لہر محسوس کرنے کے بعد جاگ اٹھے تھے۔ اسی طرح متعدد دوسرے دوستوں اور سیاسی ہمدردوں کے ساتھ دنیا بھر میں ایسے ہی واقعات پیش آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے والد کی روح اپنے تمام بہی خواہوں کے پاس سے گزر کر گئی ہوگی۔ یہ افواہیں تواتر سے پھیلتی رہیں۔

میرے والد کے چچازاد اور پیپلز پارٹی کے راہنما ممتاز علی بھٹو نے سہالہ میں تعزیت کے دوران مجھ پر زور دیا کہ میں والد کی نعش کو قبر سے نکلوا کر پوسٹ مارٹم کے لیے کہوں۔ اس سے ہمیں سیاسی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ سیاسی فائدہ؟ میرے والد فوت ہو چکے۔ قبر سے نعش کو باہر نکلوا کر وہ دوبارہ زندہ تو نہیں ہو سکتے۔

''انھوں نے میرے والد کو مارنے سے قبل ان کو موت کی کوٹھڑی میں کب زندہ رہنے دیا تھا'' میں نے چچا ممتاز کو بتایا ''اب وہ آزاد ہیں' اب انھیں امن میں رہنے دیں۔

''تم نہیں سمجھتیں کہ اس بات کی کیا تاریخی اہمیت ہے'' چچا ممتاز کا اصرار تھا۔

میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ ''تاریخ ان کی زندگی کا محاکمہ کرے گی۔ ان کی موت کی تفصیلات سے کوئی فرق نہیں پڑتا' میں نے کہا۔ ''میں ان کی نعش کو نہیں نکلوانے دوں گی۔ انھیں آرام کی ضرورت ہے۔''

میری والدہ کی بھانجی، فخری اور میری بچپن کی دوست سمیعہ وحید کو تعزیت کے لیے سہالہ آنے کی اجازت دے دی گئی انھیں یہ دیکھ کر تسلی ہوئی کہ ہم شدید غمزدگی کے باوجود ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوئی تھیں۔ ''ہماری شنید ہے کہ تم شدت غم سے مایوسی کے ایسے عالم میں گھری ہوئی تھیں، کہ خودکشی پر آمادہ ہوگئی تھیں'' سمیعہ نے حکومت کی طرف سے پھیلائی گئی ایک افواہ کا ذکر کیا۔

فخری جو بہت جذباتی ہے میری والدہ سے لپٹ گئی اور انھیں تسلی دینے لگی۔ ''نصرت جان! کاش میں مر جاتی اور مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا'' وہ چلاتی ہوئی پکاری ''لوگوں کا خیال ہے کہ پھانسی کا مستحق تو خود ضیاء ہے۔''

فخری میرے ساتھ بھی بغلگیر ہوئی اسی نے ہی ایک سال قبل والد کی سزائے موت کی خبر مجھے سنائی تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ میں نے اپنے کراچی کے گھر میں زیر حراست تھی وہ پولیس کے پہرہ داروں سے بچتی بچاتی مجھ تک پہنچ گئی تھی۔ میں اپنے رہائشی کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی جب وہ اچانک سامنے کے دروازے کو زور سے کھول کر ڈرائنگ کے ہال

www.bhutto.org

میں منہ کے بل گر گئی..... غم سے چلاتی ہوئی اور فرش پر اپنی پیشانی کو زور زور سے ٹکریں مارتی ہوئی آئی۔ صرف نصف گھنٹے میں فوجی حکام فخری کی حراست کا احکام بھی تیار کر کے لے آئے جب کہ وہ اپنے تن بدن میں سیاسی نوعیت کا ایک رشہ بھی نہیں رکھتی تھی اور اتنے روز و شب برج اور ماہ جونگ کے کھیل میں گزارتی تھی۔ اسے اگلے ہفتے کے لیے میرے ساتھ ہی قید کر دیا گیا اور وہ اپنے شوہر اور بچوں کے پاس واپس نہ جا سکی۔

اب ہم دونوں مل کر روئیں۔ ''سینکڑوں لوگ'' اس نے ہمیں بتایا کہ فیکٹری کارکن، ٹیکسی ڈرائیور اور عامۃ الناس موت کے تیسرے روز مذہبی رسم ''سوئم'' کی تیاری کے لیے کراچی میں ہمارے گھر کے باغ میں جمع ہو رہے تھے ہر شب ہفتوں تک خواتین قرآن پاک سروں پر اٹھائے میرے والد کے لیے دعائیں مانگنے کو بسوں میں بھری ہوئی آتی رہیں۔

''فوجی وردی جو ہمیشہ قومی تفاخر کا ایک ذریعہ رہی اب اس طرح کی علامت بن گئی'' فخری نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ کراچی سے پی آئی اے کے طیارے میں سفر کرتے وقت اس نے اور سمیعہ نے فوجی وردی میں ملبوس کسی بھی آدمی کے قریب بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ''قاتل'' وہ دونوں چیخ پڑیں۔ باقی ماندہ مسافروں نے ان کے سامنے احترام میں اپنے سر جھکائے جو اظہار افسوس کر رہے تھے کوئی دوسرا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لایا۔ ہر شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہم نے والد کی قبر پر سوئم کے لیے حاضری دینے کی مقام کو درخواست دی تھی۔ 7/اپریل کو صبح سات بجے پیغام ملا کہ پانچ منٹ میں تیار ہو جائیں۔ ہمارے پاس نوحہ خوانی کے لیے پہننے کو سیاہ کپڑے نہیں تھے اور ہمیں اسی لباس میں جو ہم قید خانے میں لے کر آئی تھیں جانا پڑا۔ ''جلدی کرو، جلدی کرو، ایکمار شللاء آفیسر اصرار کرتا رہا کچھ دیر بعد ہم کار میں ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔ لیکن وہ ہمیں ہر کام میں ہمیشہ جلد بازی کرنے پر مصر رہتے۔ اس خطرہ کے پیش نظر مبادا لوگوں کی نظر ان پر پڑ جائے اور وہ ہاتھ ہلا ہلا کر ہمارے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کریں یا کسی طریقہ سے اپنی ہمدردی ہمارے لیے ظاہر کریں اور نتیجتاً مارشل لاء سے ان کی نفرت ظاہر ہو۔''

لیکن تمام فوجی احباب غیر انسانی مشینوں میں تبدیل نہیں ہوئے تھے۔ جب ہم ائیر پورٹ پر پہنچیں فوجی جہاز کے عملہ کے افراد سر نیچے کیے گارڈ آف آنر کی شکل میں ایستادہ تھے۔ جب والدہ کار سے باہر آئیں انھوں نے سیلوٹ کیا۔ یہ اس شخص کی بیوہ کے

www.bhutto.org

لیے توقیر کی علامت تھی جو ہندوستان کے کیمپوں سے 90 ہزار سے زائد جوانوں کو آزادی دلا کر پاکستان صحیح سلامت واپس لایا تھا ہر ایک تو اس بات کو بھلا نہیں بیٹھا تھا۔ پرواز کے دوران انھوں نے چائے، کافی اور سینڈوچ پیش کیے۔ ان کے چہروں سے صدمے اور غم کا واضح اظہار ہوتا تھا۔ چند افراد کا جرم اکثریت کے ضمیر کا احساس جرم بن گیا تھا۔ طیارہ موہنجو ڈارو کے ہوائی اڈے پر نہیں اتارا گیا جو گڑھی خدا بخش سے نزدیکی فاصلے پر تھا بلکہ جیکب آباد ایئر پورٹ پر جو تقریباً ایک گھنٹے کے سفری فاصلے پر تھا اتارا گیا مقامی فوجی حکام نے ہوائی اڈے سے گاؤں کو جانے والا سیدھا راستہ جو میرے والد نے تعمیر کرایا تھا اختیار نہیں کیا بلکہ کار سڑکوں پر اچھلتی، رینگتی، بل کھاتی ہوئی کچی گلیوں میں سے گھومتی ہوئی گزری۔ ڈرائیور سیدھے راستے سے ہٹ کر جا رہا تھا تاکہ مکانوں کے دبیز پردوں میں سے بھی کوئی نہ جھانک لے اور ہمیں پہچان لے۔ ہم جب خدا خدا کر کے خاندانی قبرستان کے دروازے تک پہنچیں تو گرد اور پسینے سے شرابور ہو چکی تھیں۔

میں تنگ ڈیوڑھی میں سے آگے بڑھی تو ایک فوجی افسر میرے پیچھے آیا۔ میں وہیں کھڑی ہو گئی۔

''ہمیں حکم ملا ہے کہ آپ کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔'' اس نے بتایا۔

''میں تمہیں اندر آنے کی اور اس جگہ کے تقدس کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

میں نے اسے کہا ''تم نے میرے والد کو قتل کیا ہے تم ہی اس کو یہاں لائے ہو۔ اگر ہم اب اس کے لیے رو اور چلا رہے ہیں تو ہمیں تنہائی میں یہ کام کرنے دو۔''

''ہمیں حکم ہے کہ ہم ہر وقت آپ کے ساتھ رہیں۔'' اس نے اصرار کیا۔

''تب ہم قبر کی زیارت نہیں کریں گی۔ ہمیں واپس لے چلو۔'' میری والدہ نے واپسی کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا اور ہم دیوار دار قبرستان میں داخل ہو گئیں۔ تقدس کی علامت کے طور پر ہم نے اپنے جوتے باہر ہی اتار دیے۔ ہمیں ماحول کس قدر پُرسکون محسوس ہوا اور کس قدر مانوس۔ بھٹو خاندان کے آباؤ اجداد نسل در نسل وہاں لیٹے ہوئے تھے۔ میرے دادا سر شاہنواز خاں بھٹو، ریاست جونا گڑھ کے سابق وزیر اعظم جنہیں

www.bhutto.org

ہندوستان کی تقسیم سے قبل بمبئی پریزیڈنسی میں خدمات کے عوض حکومت برطانیہ نے ''سر'' کا خطاب دیا تھا۔ ان کی بیوی خورشید بیگم، میرے چچا سکندر بھٹو اور ان کے بھائی امداد علی جن کی شخصیت ایک حکائت بن گئی تھی وہ اتنے خوبصورت تھے کہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ ایلفنسٹن سٹریٹ میں سے اپنی بگھی پر گزرتے جو کراچی کا عظیم خرید و فروخت کا مرکز ہے تو انگریز عورتیں ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے اپنی دوکانوں سے باہر آجاتی تھیں۔ دوسرے متعدد رشتے دار بھی وہیں آسودہ خاک تھے۔ یہ وہ زمین تھی جہاں ہماری پیدائش ہوئی اور جہاں مرنے کے بعد ہماری مراجعت ہوگی۔

میرے والد اس سرزمین پر مجھے اس وقت لائے جب میں 1969ء میں پاکستان سے ہارورڈ یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لیے جانے والی تھی۔ ''تم دور دراز جگہ پر امریکا میں جارہی ہو'' میرے والد نے یہ بات اس وقت کہی جب ہم اپنے آبائی قبرستان میں کھڑے تھے۔ ''تم متعدد حیرت انگیز چیزیں دیکھو گی اور ایسی ایسی جگہوں تک سفر کرو گی جو تم نے پہلے کبھی سنی تک نہیں۔ لیکن یاد رکھو کہ زندگی میں جن واقعات سے بھی واسطہ پڑے آخر کار تمہیں واپس یہیں آنا ہے۔ تمہاری جگہ یہی ہے۔ تمہاری جڑیں یہاں ہیں۔ لاڑکانہ کی مٹی، گرد اور گرمی تمہاری ہڈیوں میں موجود ہے۔ اور یہی جگہ ہے جہاں تمہیں دفن بھی ہونا ہے۔''

اپنے اشکوں کے درمیان میں ان کی قبر تلاش کر رہی تھی۔ مجھے مطلقاً علم نہیں تھا کہ انھوں نے انھیں کہاں دفن کیا تھا۔ میں نے جب ان کی قبر دیکھی تو میری پہچان سے باہر تھی۔ وہ فقط کیچڑ کا ایک ڈھیر تھی گیلی مٹی کا کیچڑ جس پر پھولوں کی پتیاں چھڑکی ہوئی تھیں ممی اور میں قبر کے پاؤں کی طرف بیٹھ گئیں مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میرے والد یہاں مدفن ہیں۔ میں فرط غم میں وہیں گر گئی اور کیچڑ کے اس حصے کو چوما جہاں میں نے تصور میں ان کے پاؤں دیکھے۔

''مجھے معاف کر دیجئے، پاپا! اگر میری وجہ سے آپ کو کوئی دُکھ پہنچا ہو۔'' میں نے آہستہ سے پکارا۔

تنہا میں نے اپنے آپ کو تنہا محسوس کیا۔ سب بچوں کی طرح میں اپنے والد کی ہمیشگی کا ایک تصور رکھتی تھی۔ اب جب کہ میں انھیں کھو چکی تھی میں نے ایک خلاء محسوس کیا جسے کبھی بھرا نہ جاسکتا تھا۔ لیکن میں روئی نہیں کیوں کہ بطور مسلمان میرا یقین تھا کہ آنسو

www.bhutto.org

روح کو زمین کی طرف واپس لے آتے ہیں اور اس کی آزادی سلب کر لیتے ہیں۔

میرے والد نے اتنی آزادی ضرور حاصل کی تھی اور اپنے سکون کے لیے بہت بڑی قیمت ادا کی تھی ان کا ابتلاء ختم ہو چکا تھا۔ ''سب عز و شان اسی ایک ذات کے لیے ہے جو تمام اشیاء پر قدرت رکھتا ہے'' میں نے قرآن پاک کی سورہ یٰسین سے اس آیت کی تلاوت کی۔ ''اسی کی طرف تم سب لوٹ جاؤ گے۔''

میرے والد کی روح جنت میں اللہ کے پاس تھی۔

فوجی حکم پھر ہمیں ایک مختلف اور تکلیف دہ راستے پر سے ایئر پورٹ واپس لے گئے لیکن وہی طیارے کا عملہ دوبارہ لائن میں سیدھا کھڑا تھا تاہم سہالہ جانے پر ہماری تلاشی کے دستور میں کوئی فرق نہیں پڑا اور نہ ہی ان کمروں کی غلاظت میں جہاں ہمیں جانے سے پہلے ٹھہرایا گیا تھا۔ تاہم امن اور ایک نئے یقین کا احساس سمجھ پر چھا گیا تھا۔ ''چیلنج کا مقابلہ کرو، مسلط کردہ ہر بگاڑ کے خلاف لڑو۔ دشمن پر غلبہ حاصل کرو'' بچپن میں میرے والد جو قصے کہانیاں سناتے رہے ان میں سچائی کو برائی پر ہمیشہ فتح نصیب ہوئی۔

''آیا تم موقع کو بروقت جھپٹ لیتی ہو یا اسے ہاتھوں سے پھسل جانے دیتی ہو۔ آیا تم جلد باز ہو یا سوچ بچار کرنے والی۔ آیا تم مضبوط اعصاب کی مالک ہو یا بزدل۔ یہ انتخاب تمہارا اپنا ہے۔ انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ اپنی تقدیر کی تشکیل تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔''

اب ایک دہشت پورے پاکستان پر محیط تھی میرے والد کا مطمح نظر میرا اپنا مطمح نظر بن گیا تھا میں نے اس وقت بھی یہی محسوس کیا تھا جب میں ان کی قبر کے سرہانے کھڑی تھی۔ ان کی روح کا اعتماد اور قوت مجھ میں سرایت کر گئی تھی۔ اسی طرح میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں پاکستان میں جمہوریت آنے تک چین سے نہیں بیٹھوں گی۔ میں نے پختہ وعدہ کیا کہ امید کی جو شمع میرے والد نے جلائی ہے اسے ہمیشہ زندہ رکھوں گی۔ میرے والد پاکستان کے وہ پہلے راہنما تھے جو تمام طبقات کی نمائندگی کرتے تھے وہ صرف فوج یا اصراف ہی کے نمائندہ نہ تھے بلکہ وہ پاکستان کے کروڑوں غریب عوام کے نجات دہندہ بھی تھے اب یہ ہم پر تھا کہ ہم ان کی جدوجہد کو جاری رکھیں۔

جب میری والدہ اور مجھے والد کے سوئم کے بعد سہالہ واپس لیجایا جا رہا تھا، سپاہی

www.bhutto.org

ان سینکڑوں افراد پر آنسو گیس پھینک رہے تھے جو 70 کلفٹن کے باغ میں میرے والد کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے جوق در جوق جمع ہو رہے تھے۔ آنسو گیس کے گولوں کی شدت اس قدر تھی کہ صحن میں لگائے گئے شامیانے کو آگ لگ گئی ہاتھوں میں قرآن کریم پکڑے ہوئے غم زدہ لوگ اپنی رندھی ہوئی آوازوں کے ساتھ وہاں سے بکھر گئے۔

اپنے ہی گھر میں نظر بند

محترمہ بے نظیر بھٹو مزید لکھتی ہیں کہ میرے والد کی شہادت کے سات ہفتے بعد، میری والدہ اور مجھے مئی 1979ء کے اواخر میں سہالہ سے رہا کر دیا گیا۔ ہم کراچی میں اپنے خاندانی گھر 70 کلفٹن میں واپس آ گئیں۔

ہر چیز معمول کے مطابق تھی لیکن پھر بھی کچھ بھی معمول کے مطابق نہیں تھا۔ 70 کلفٹن کے دروازے پر ''ذوالفقار علی بھٹو، بار ایٹ لاء'' کی کانسی سے بنی ہوئی نام کی تختی آویزاں تھی۔ اس کے اوپر ایک اور کانسی کی تختی تھی جس پر میرے دادا کا نام ''سر شاہنواز بھٹو'' کندہ کیا ہوا تھا۔ مگر ایک مدت گزر جانے کے باعث مدھم پڑ چکا تھا۔ میری دادی اماں نے 1953ء میں میری پیدائش کے جلد ہی بعد یہ وسیع و عریض دو منزلہ بنگلہ تعمیر کروایا تھا۔ میرے بھائی، بہن اور میں اسی بنگلہ میں ایک میل کے چوتھائی فاصلے کی دوری پر بحیرہ عرب کی ٹھنڈی ہواؤں کے جلو میں جوان ہوئے تھے۔ کون اس المیے اور تشدد کا تصور کر سکتا تھا جو اس پرسکون خاندان کے گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔

ہر روز نوحہ خوانی کرتے ہوئے سینکڑوں لوگ کراچی کے صحرا سے ہمارے گھر کے ناریلوں، آموں اور سرخ و زرد پھولوں سے لدے درختوں کے باغ میں ہمیں دلاسہ دینے کے لیے آ جاتے۔ سینکڑوں مزید افراد اپنے راہنما کے خاندان سے تعزیت کرنے کے لیے دور دراز علاقوں سے آ کر باہر صبح سے انتظار کرتے۔ میری والدہ ابھی عدت میں تھیں اور غیروں کا استقبال نہیں کر سکتی تھیں۔ وہ مجھے ان لوگوں کے استقبال کے لیے باہر بھیج دیتیں۔

گھر میں ہونے کی انسیت ہماری دہشت میں کسی تخفیف کا باعث نہ بن سکی۔ ہمارے گھر کے عملہ نے ہمیں بتایا۔ ''میرے والد کو پھانسی دیے جانے سے دو راتیں قبل'' ''70 کلفٹن پر دوبارہ چھاپا مارا گیا، حکومتی اہلکار چھت اور باغ کی تلاشی لیتے رہے، میری

www.bhutto.org

والدہ کی الماری اور میرے والد کے ملبوسات کی الماری کی تلاشی لیتے رہے'' کیا تمہارے پاس تلاشی کا وارنٹ ہے۔ گھر کے عملہ میں سے ایک نے استفسار کیا کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ شہری قانون میں وارنٹ کے بغیر تلاشی ممنوع ہے۔ ''میں خود تلاشی لینے والی پارٹی کے ہمراہ ہوں اس لیے کسی وارنٹ کی ضرورت نہیں'' ایک فوجی افسر نے جو پولیس لے کر آیا تھا، دعویٰ کیا۔ دس گھنٹے تک انھوں نے گھر کی ہر چیز تہس نہس کردی، جاتے ہوئے وہ میرے بیڈ روم سے میرے ذاتی خطوط اور دو سیاہ رنگ کے بریف کیس جن میں بنک کے کاغذات اور کچھ چیک تھے ساتھ لے گئے اور ان میں وہ ثبوت بھی تھے جو میں نے اپنے والد کے خلاف بدعنوانی کے جعلی الزامات کے استرداد میں اکٹھے کیے تھے۔

''یہاں خفیہ الماریاں اور دیگر راستے بھی ہیں وہ ہمیں دکھاؤ'' فوجی افسر نے عملے کو حکم دیا۔ پھر ان کو اس بنا پر پیٹا کہ ان کا جواب نفی میں تھا۔ جب تلاشی ختم ہوگئی تو گھر کے ملازمین کو استقبالیہ کے کمرے میں لے گئے اور وہاں انھیں مقفل کر دیا۔ جب صبح سویرے دودھ دینے والا آیا تو اسے بھی ان کے ساتھ قید کر دیا۔ یہی حادثہ اخباری ایجنٹ کے ساتھ پیش آیا۔ فوجی افسران مایوس اور جذباتی ہو رہے تھے۔ ''اس کاغذ پر دستخط کرو'' ایک افسر نے عملہ کے ایک ملازم کو حکم دیا۔ اس نے انکار کر دیا۔ افسر نے اسے دھمکی دی۔

''تمہیں علم ہے کہ تمہارے صاحب کے ساتھ کیا سلوک ہوا ہے؟'' اگر تم دستخط نہیں کرتے تو تصور کرو تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوگا'' وہ ملازم اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اس نے دستخط کر دیے۔

جب تلاشی کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا ایک ٹرک دروازے میں سے اندر داخل ہوا۔ فوجی سپاہیوں نے ایک سرخ قالین بچھا دیا اس پر مختلف دستاویزات بکھیر دیں جو ٹرک ہی سے برآمد ہوئیں اس کے بعد پریس کے رپورٹرز کو بلا لیا گیا تاکہ میرے والد کے خلاف ''نئے ثبوت'' کی تصاویر کھینچ لی جائیں۔

متعدد لوگوں کا خیال ہے کہ سپریم کورٹ کی متفقہ سفارش کی وجہ سے کہ میرے والد کی سزائے موت کو تاحیات عمر میں بدل دیا جائے گا۔ حکومت کی طرف سے ان کے خلاف ایک اور مقدمہ بنانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ اس دوران اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں جب دوپہر کے بعد چھاپہ مار پارٹی وہاں سے روانہ ہوئی تو وہ اپنا ''ثبوت'' بھی اپنے ساتھ

www.bhutto.org

لے گئی اور ہماری بتاسی ذاتی قیمتی اشیاء بھی جن میں میرے والد کے قدیم یادگاری نقشوں کا ایک مجموعہ بھی تھا۔

70 کلفٹن میں اب میں لاڑکانہ جانے کی تیاریاں شروع کر دیتی ہوں۔ تاکہ اپنے والد کے مزار پر حاضری دے سکوں۔ حکومت کو میرے لائحہ عمل کا علم ہو جاتا ہے اور ہوائی جہاز کی مقررہ پروازیں منسوخ کر دی جاتی ہیں۔ میں ٹرین کا سفر اختیار کرتی ہوں۔ ہر اسٹیشن پر لوگوں کا زبردست ہجوم میرا استقبال کرتا ہے۔ جہاں اسٹیشن موجود نہیں وہاں لوگ ریلوے لائن پر ٹرین کو رکوانے کے لیے لیٹ جاتے ہیں۔ ''انتقام انتقام'' لوگوں کا انبوہ پکار اٹھتا ہے۔ ''ہمیں ضیاء کو انتخاب میں شکست دینے کے لیے اپنے غم کو قوت میں تبدیل کرنا ہے'' لوگوں کے عظیم اجتماع سے حوصلہ پکڑتے ہوئے میں انھیں کہتی ہوں۔ لوگوں کا یہ زبردست ہجوم ہی ہمارے سیاسی مخالفوں کے پراپیگنڈہ کا بہترین جواب ہے جو اعلانیہ کہتے پھرتے تھے کہ ''بھٹو کی عوامی قوت کو اور اس کے ساتھ ہی پاکستان پیپلز پارٹی کو ہم نے اس کی قبر میں دفن کر دیا ہے۔''

کراچی میں لاڑکانہ روانہ ہونے سے قبل، میں ہر دس منٹ کے وقفہ سے صبح 9 بجے سے رات 9 بجے تک پی پی پی کے راہنماؤں اور معاونین سے ملاقات کرتی تھی۔ ہر چند گھنٹوں بعد میں ملاقاتیوں سے اجازت لے کر باغ میں بیٹھے ہوئے تعزیت کنندگان سے بھی جا کر ملتی تھی۔ ان کی آنکھیں مجھے دیکھتے ہی چمک اٹھتی تھیں اور اسی طرح میری والدہ کی عدت کے بعد انھیں اور مجھے ملتے ہی شروع شروع میں عام لوگوں کا خیال تھا کہ ہم بھٹو صاحب کی شہادت کے صدمہ کے بعد یا عہد حراست سے جانبر نہیں ہو سکیں گی۔ کیوں کہ ہم نے ان کی سخت زندگی کے مقابل میں زیادہ آرام دہ اور پر آسائش زندگی گزاری تھی۔ لیکن ہمیں بنفس نفیس اپنے درمیان دیکھ کر ان کی آنکھیں نئی امید سے روشن ہو جاتی تھیں۔ ایک گروہ باغ سے باہر جاتا تو ایک نیا گروپ داخل ہو جاتا، بوقت شب میں پارٹی کے اہم انتظامی و پالیسی امور اور سیاسی اسیران کے معاملات پر اپنی والدہ کے مطالعہ کے لیے بریف تیار کرتی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں اپنا کام مکمل نہیں کر سکوں گی اور شاید نہ کر سکتی اگر مجھے اپنی سکول کی دوست سمیعہ اور اسی طرح آمنہ اور یاسمین کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ نوجوان آمنہ اور یاسمین والد کی سزائے موت کے خلاف اپیل کا مقدمہ لڑتے ہوئے میری دوست

www.bhutto.org

اور معاون رہیں۔ مغربی پریس نے سمیعہ، آمنہ اور یاسمین کو ''چارلی کے فرشتے'' کا لقب دیا۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ اس قدر بوجھ تلے حقیقی چارلی کے فرشتے بھی دم توڑ جاتے۔

میرے والد کی موت کے پروانے پر دستخط کرنے سے پہلے جنرل ضیاء نے عوام الناس کو خاموش رکھنے کے لیے انتخابات کے وعدے کا اعلان کر دیا اور تاثر دیا کہ اس طرح ملک فوجی آمریت سے جمہوری حکومت کی سمت روانہ ہوگا۔ لیکن کیا وہ پی پی پی کے جیت جانے کا جواء کھیل سکتا تھا۔ اس نے برملا یہ اعلان کیا تھا کہ کسی صورت حکومت ان لوگوں کے حوالے نہیں کرے گا جن سے اس نے چھینی تھی اور صرف مثبت نتائج والے انتخابات ہی اسے منظور ہوں گے۔ ضیاء اس مشکل میں پہلے بھی پھنسا تھا جب اس نے 1977ء میں میرے والد کا تختہ الٹنے کے بعد انتخابات کے جلد انعقاد کا اعلان کر دیا تھا جب اسے پی پی پی کی جیت کا انتخابات میں یقین ہوگیا تو اس نے انتخابات منسوخ کر دیے اور پارٹی کے راہنماؤں کو حراست میں لے لیا۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟

بلدیاتی انتخابات پہلے آتے ہیں یعنی ستمبر کے مہینے میں پی پی پی ہر جگہ جیت جاتی ہے۔ اب قومی انتخابات کی باری ہے۔ ضیاء کو اپنی حکومت کے قانونی جواز کے لیے جیتنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ حکومت قانون کو پی پی پی کے خلاف ہر طرح استعمال کرے گی، ہماری پارٹی کے رہنما 70 کلفٹن میں اس مباحثہ کیلیے جمع ہوتے ہیں کہ آیا قومی انتخابات میں حصہ لیا جائے ان کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ''انتخابی میدان کو خالی نہیں چھوڑنا چاہیے'' میں دلیل دیتی ہوں کہ یوں میرے والد نے مجھے ایک دفعہ یہی سمجھایا تھا۔ ''خواہ زبردست مشکلات کا سامنا ہو خواہ قوانین کو مرضی کے مطابق مروڑا گیا ہو' ہمیشہ مقابلے کی تیاری کرو'' قوانین کو یقیناً مرضی کے مطابق مروڑا گیا ہے۔ ہماری توقع کے عین مطابق پی پی پی کے انتخابات میں حصہ لینے کے اعلان پر ضیاء قوانین کو بدل دیتا ہے۔ ''اپنی پارٹی کو سیاسی جماعت کے طور پر رجسٹر کراؤ ورنہ شرکت کی اجازت نہیں ملے گی'' حکومت ہمیں اطلاع دیتی ہے۔ ہم انکار کر دیتے ہیں۔ رجسٹر کرانے کا مطلب ہے کہ ہم ضیاء کی حکومت کو قانونی مانتے ہیں۔

''ہم آزاد امیدوار کھڑا کریں گے'' ہم فیصلہ کرتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں یہ بھی فہم ہے کہ بیلٹ پیپر پر پارٹی نشان کے بغیر ہم ایک بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں، کیوں کہ ہمارے

www.bhutto.org

معاشرے میں خواندگی کی شرح سرکاری طور پر 27 فیصد ہے مگر حقیقی شرح 8 فیصد ہے۔
حکومت شرائط لگا دیتی ہے ''آزاد امیدواروں کو جیتنے کے لیے ووٹوں کا 51 فیصد حصول لازمی ہوگا'' یہ نئے قوانین ہیں۔
''اچھا تو ایسے ہی سہی ہم حصہ لیں گے'' یہ ہمارا فیصلہ ہے۔
لیکن 15/اکتوبر 1979ء کو انتخابات کی مقررہ تاریخ سے ایک ماہ قبل پی پی پی اپنے اعلیٰ کارکنوں کی درخواست پر اپنا اجلاس منعقد کرتی ہے۔ انتخابات میں شرکت کا سوال دوبارہ پیش کیا جاتا ہے اور پارٹی اس سوال پر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ 70 کلفٹن کے حجرۂ طعام میں جہاں کانفرنس کا انعقاد جاری ہے متعدد کارکن میری والدہ پر زور دیتے ہیں کہ بائیکاٹ کریں۔ ''بائیکاٹ، بائیکاٹ'' ان کا نعرہ بن جاتا ہے۔ بعض کارکن مجھے علم ہے، تنہائی میں مجھے ''بیوقوف چھوٹی لڑکی'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن میں دوبارہ بولتی ہوں۔
''قوانین کی متواتر تبدیلی کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ضیاء اپنا اعتماد کھو چکا ہے'' ''ہمیں اپنا اعتماد برقرار رکھنا ہے ہم نے بلدیاتی انتخابات جیتنے ہیں اور ہم عام انتخابات بھی جیت جائیں گے'' کافی رات گئے پی پی پی بہت تھوڑے مارجن سے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کر پاتی ہے۔ جب اگلے دن ضیاء کو ہمارے فیصلے کی اطلاع ملتی ہے اس کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ مارشل لاء کا منتظم اعلیٰ 1977ء کا طریقہ واردات اپناتا ہے۔ انتخابات یکسر منسوخ کر دیے جاتے ہیں اور فوجی سپاہیوں کو 70 کلفٹن کے محاصرہ کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ گھر کے عملے کو ایک فرد نصف شب کے وقت مجھے محاصرہ کی اطلاع دیتا ہے۔ جلد ہی میں اپنے تمام یاسی کاغذات کا پلندہ، پارٹی مسودات، رکنیت کی فہرستیں، خطوط، جیل میں نظر بند اراکین کی فہرستیں وغیرہ، غسل خانے میں پھینک کر ان کو جلا دیتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ حکومت کو آسانی سے گرفتاری کے لیے یہ فہرستیں دستیاب ہو جائیں۔ چند منٹ بعد فوجی سپاہی گھر میں داخل ہوتے ہیں میری والدہ اور مجھے بندوق کی نوک پر ہمارے دیہات کے گھر ''المرتضیٰ'' میں لے جاتے ہیں جہاں ہمیں آئندہ چھ ماہ کے لیے نظر بند رکھا جائے گا۔
المرتضیٰ کی زیر حراست ماحول میں، میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتی ہوں اگرچہ جنرل ضیاء کی سازش کے تحت اقتدار کے قبضہ کر لینے کے وقت سے یعنی دو سال قبل سے میری والدہ کی یہ نویں اور میری ساتویں نظر بندی ہے۔ میں اس جبری تنہائی کو برداشت نہیں

www.bhutto.org

کر پا رہی۔ ہر اذیت پر میرے دل میں غصے کی ایک لہر کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ شاید 26 سالہ ہونے کی وجہ سے یہ میری عمر کا تقاضا ہے۔ لیکن میری سوچ ہے کہ کسی بھی عمر میں المرتضیٰ میں نظر بندی پر شاید میرے خیالات مختلف نہیں ہوں گے۔

المرتضیٰ ہمارے خاندان کے دل کی حیثیت رکھتا ہے جہاں ہم چہار دانگ عالم سے ہمیشہ واپس آ جاتے تھے خواہ ہمیں موسم سرما کی تعطیلات کاٹنی ہوں۔ ماہ رمضان کے خاتمہ پر عید منانی ہو..... والد کی سالگرہ کا دن ہو..... خاندانی شادیاں ہوں یا زمینوں پر رہائش پذیر ہمارے متعدد رشتے داروں میں سے کسی کی مرگ پر تعزیت کرنا ہو اب حکومت نے اسی المرتضیٰ کو میری والدہ اور میرے لیے (قید خانے) سب جیل کا درجہ دے دیا ہے۔

مغربی پریس کو بتایا گیا ہے کہ حکومت نے ہمیں گھر پر نظر بند کر رکھا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے پاکستان میں گھر کی نظر بندی کا مطلب سرکاری نظر بندی سے مختلف ہے۔ نظر بند شخص کو دوست احباب سے ملاقات کی اجازت ہوتی ہے۔ پریس کو انٹرویو دے سکتے ہیں۔ مقامی اور طویل فاصلے کی ٹیلی فون کالوں کی اجازت ہوتی ہے کتابیں لائی جا سکتی ہیں بعض اوقات تھوڑے سے فاصلے تک گاڑی بھی چلا سکتے ہیں اور گھر سے باہر میٹنگ میں بھی جا سکتے ہیں۔ المرتضیٰ کو سب جیل قرار دیے جانے پر اسے قید خانہ قرار دے دیا گیا ہے۔ جہاں جیل کے قوانین کے ضابطہ پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ ہمارا ٹیلی فون کاٹ دیا گیا ہے میری والدہ اور مجھے گھر کے صحن میں نظر بند کر دیا گیا ہے۔ وائے صنم کے کسی دوست اور احباب کو ملنے کی مطلق اجازت نہیں۔ گھر کو اندر اور باہر سے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے قبائلی پٹھانوں پر مشتمل فرنٹیئر فورس اب صرف اس مقصد کے حصول کے لیے متعین کی گئی تھی تاکہ اس کی بیوہ اور بیٹی کو اندر سے باہر نہ جانے دیا جا سکے۔ ضیاء کی خواہش ہے کہ ملک اور باہر کی دنیا بالکل بھول جائے کہ بھٹو نام کے خاندان کا کوئی وجود بھی ہے۔

پاکستان میں اخبارات شاذ و نادر ہی ہمارے نام چھاپنے کی جرأت کرتے ہیں۔ 16/اکتوبر 1979ء جب ضیاء نے دوسری مرتبہ انتخابات کے انعقاد کو منسوخ کیا اور میری والدہ اور مجھے نظر بند کیا۔ مارشل لاء قوانین کی ضخیم فہرست میں پریس پر مکمل سنسر شپ نافذ کر کے ایک اور قانون کا اضافہ کر دیا۔ مارشل لاء حکم نمبر 49 کے مطابق کسی جریدے کا مدیر جو پاکستان کی سلامتی، یکجہتی اور خود مختاری کے خلاف یا اخلاقیات اور امن عامہ کے خلاف کسی مواد

www.bhutto.org

کی اشاعت کا انتظام کرنا ہے۔ اسے دس کوڑوں اور 25 سال کی قید سخت کی سزاء دی جائے گی۔

ہمارا پارٹی ترجمان اخبار مساوات جس کی اشاعت صرف لاہور میں ایک لاکھ تک پہنچ چکی تھی بند کر دیا گیا اور اس کی پریس ضبط کر لی گئی۔ دوسرے اخبارات کو بھی سنسر شپ قوانین کی خلاف ورزی کی صورت میں مکمل بندش یا اخباری کاغذ اور اشتہارات کی سپلائی میں کٹوتی کی دھمکی دی گئی۔ اگلے چھ برس تک میرے والد، والدہ اور میری تصویر کی اشاعت کبھی کبھار ہی کسی اخبار میں شائع ہوئی۔ اس طرح ہماری ہمدردی میں ہمارا نام تک بھی اخبارات کی اشاعت میں مفقود تھا۔ اگر فوجی سنسر کی نظر میں کسی خبر میں ہمارے ساتھ ہمدردانہ سلوک مترشح ہوتا تو وہ اخبارات کی فریم کردہ خبروں میں سے اسے کاٹ دیتے۔ بعض اوقات اخبار کے تمام کالم خالی ہی چھاپے جاتے تاکہ قارئین پر واضح ہو جائے کہ قابل اشاعت مواد سنسر کی قینچی کی نذر ہو گیا ہے۔ پی پی پی کی طاقت نے ضیاء کو سیاسی پابندیاں ظالمانہ حد تک نافذ کرنے پر مجبور کر دیا۔ 1977ء میں مارشل لاء کے نفاذ کے وقت سے سیاست میں حصہ لینے والے کسی بھی شخص کو کوڑوں اور قید کی سزاء دی جاتی۔ لیکن اکتوبر 1979ء سے فوجی حکومت نے اعلانیہ قانون نافذ کر دیا کہ تمام سیاسی پارٹیاں غیر قانونی ہیں یہ ایک کھلم کھلا کوشش تھی کہ میرے والد کی عوامی پالیسیوں کے لیے عوامی ہمدردی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ جنرل ضیاء کا مارشل لاء حکم نمبر 48 بین طور پر کہتا ہے ''پاکستان میں تمام سیاسی پارٹیوں کا وجود بمع ان کے گروہ، شاخیں اور فرقے فوری طور پر ختم کیا جاتا ہے'' کسی سیاسی جماعت کا کوئی رکن یا کوئی بھی شخص جو خفیہ طور پر بھی اپنے آپ کو رکن کہتا ہے 14 سال قید بامشقت، اپنی جائیداد کی ضبطی اور 25 کوڑوں کی سزاء کا متوجب ہوگا'' آج سے آئندہ کے لیے اخبارات میں جہاں بھی پی پی پی کا ذکر ہوگا اس کے ساتھ ''سابق'' کا لاحقہ استعمال کرنا لازمی ہوگا۔ میری والدہ اور میں اس طرح سابق جمہوریت میں ایک پارٹی کی سابقہ رہنما بن کر رہ گئیں۔

www.bhutto.org

بھٹو کا اندازِ حکومت

27 دسمبر 1971ء کو جب کہ ملک ٹوٹ چکا تھا اور مشرقی پاکستان پر بھارتی افواج کی کٹھ پتلی عوامی لیگ اور مکتی باہنی کا قبضہ ہو چکا تھا، ذوالفقار علی بھٹو نے مغربی پاکستان میں نظر بند شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کر کے انھیں اس بات کی دعوت دی کہ وہ متحدہ پاکستان کے صدر بن جائیں۔ تاہم شیخ مجیب الرحمٰن نے بھٹو کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن کے درمیان ہونے والے ان مذاکرات کا ایک ایک لفظ نوٹ کیا گیا تھا کیوں کہ بھٹو نہیں چاہتے تھے کہ آنے والا مورخ سانحہ مشرقی پاکستان کے لیے انھیں مورد الزام ٹھہرائے۔ بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن سے دوران مذاکرات بار بار یہ سوال دھرایا کہ کیا مشرقی پاکستان کو دوبارہ پاکستان کا حصہ بنایا جاسکتا ہے اور مجیب الرحمٰن انتہائی محتاط انداز میں مسلسل یہی کہتے رہے کہ ''میں ڈھاکہ جا کر حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی کسی قسم کی رائے دینے کے قابل ہوں گا کیوں کہ میں تو نظر بند ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ میری نظر بندی کے دوران وہاں (مشرقی پاکستان میں) کیا کچھ ہوا ہے۔'' شیخ مجیب الرحمٰن کو بھی اچھی طرح اندازہ تھا کہ بھٹو کے ساتھ ہونے والی ان کی گفتگو کہیں اور بھی سنی جارہی ہے اس لیے انھوں نے کوئی ایسی بات نہ کہی جس کو بھٹو Exploit کر پاتے۔ تاہم بھٹو اور مجیب کے درمیان ہونے والی اس ملاقات کا ایک نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ حکومت نے 8 جنوری 1972ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کو رہا کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی شہنشاہ ایران کو دورۂ پاکستان کی دعوت دی جو 7 جنوری 1972ء کو لاڑکانہ پہنچے۔ بھٹو نے ایک نئے اور خوشحال پاکستان کی تعمیر کے لیے شاہ ایران سے مدد کی درخواست کی جس کے بعد بھٹو نے ترکی، مراکش، مصر اور شام کا دورہ کیا۔ 23 جنوری 1972ء سے 28 جنوری 1972ء تک کے اس

www.bhutto.org

غیر ملکی دورے کے دوران بھٹو نے دولت مشترکہ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ امریکا کے پاس اب سوائے اس بات کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھٹو کے کچھ عرصہ کے لیے ناز نخرے اٹھائے، لہٰذا واشنگٹن نے 19 فروری 1972ء کو پاکستان کی امداد بحال کر دی۔ اگرچہ سانحہ مشرقی پاکستان کے بعد چاروں صوبوں کی سیاسی جماعتوں کو بچے کھچے پاکستان کو بہتر بنانے کے لیے مل جل کر کام کرنا چاہئے تھا لیکن سرحد اور بلوچستان میں غیر ملکی مداخلت کے باعث ہنگامے اور تخریب کاری شروع ہوگئی۔ بھٹو اس صورت حالات کو سختی سے کچلنا چاہتے تھے جب کہ فوج کے سربراہ گل حسن اس پالیسی سے متفق نہ تھے جس پر بھٹو نے 3 مارچ 1972ء کو گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خاں سے استعفیٰ لے کر انھیں فارغ کر دیا۔ اسی روز جنرل ٹکا خاں کو فوج کا سربراہ بنا دیا گیا جب کہ ایئر مارشل ظفر چوہدری فضائیہ کے سربراہ بنے۔ بدلتی ہوئی بین الاقوامی صورت حالات کے باعث بھٹو نے 15 مارچ 1972ء کو روس کا دورہ کیا۔ 19/اپریل 1972ء کو آئین ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جس نے بھٹو کے صدارت کا عہدہ سنبھالنے کی توثیق کی اور 17 اپریل کو مارشل لاء ختم کرنے کے لیے عبوری آئین منظور کر لیا گیا جس کے باعث 21 اپریل 1972ء کو ملک سے مارشل لاء کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 29 مئی سے 10 جون کے درمیان عراق، سعودی عرب، ترکی اور ایران کا دورہ کیا جس کا مقصد بھارت کی قید سے پاکستانی فوجیوں کی رہائی کو یقینی بنانے کے لیے بھارت پر دباؤ ڈالنا تھا۔ بھٹو کی کامیاب خارجہ پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ 21 جون 1972ء کو جب پاکستانی وفد ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں بھارت گیا تو تمام اسلامی ممالک کا بھارت پر دباؤ موجود تھا کہ وہ پاکستانی قیدی رہا کرے۔ یوں 2 جولائی 1972ء کو پاکستان اور بھارت کے درمیان شملہ معاہدے کے نام سے ایک نیا سمجھوتہ طے پایا جس کے تحت جنگی قیدی واپس آنا شروع ہوگئے۔ بھٹو نے اس دوران ملک کو نیا آئین دینے اور جمہوریت بحال کرنے کے لیے اپوزیشن سے مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھا جس کے نتیجے میں 12/اگست 1973ء کو پاکستان کا تیسرا آئین نافذ ہوا اور بھٹو کو وزیر اعظم منتخب کر لیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے صدر کا عہدہ دو روز پہلے فضل الٰہی مرحوم کے حوالے کر دیا تھا، جب کہ اکتوبر 1973ء کو بھٹو امریکا گئے۔ 15 ستمبر 1973ء میں انھوں نے مشرق وسطیٰ اور دسمبر 1973ء میں خلیجی ملکوں کا دورہ کیا۔ یکم جنوری 1974ء کو 15 نجی بینکوں اور بڑے بڑے صنعتی

www.bhutto.org

اور تجارتی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا گیا جس کے بعد اسلامی کانفرنس کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ 39 اسلامی ممالک کے سربراہ اور نمائندے 22 سے 24 فروری 1974ء کے درمیان پاکستان آئے اور تین روزہ اسلامی کانفرنس میں بیت المقدس کو آزاد کروانے اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کی فضاء کو بہتر بنانے کے لیے اہم فیصلے ہوئے۔ 22 فروری 1974ء کو ہی پاکستان نے بنگلہ دیش کو منظور کیا جب کہ 30 اپریل کو آخری جنگی قیدی امیر عبداللہ خاں نیازی رہا ہو کر پاکستان پہنچے جس کے بعد بھٹو نے 11 مئی 1974ء کو چین کا دورہ کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے اس دورے کا مقصد بھارتی ایٹمی پروگرام کا مقابلہ کرنے کے لیے چین سے تعاون حاصل کرنا تھا۔ چین کے دورے کے بعد بھٹو کے امریکا کے ساتھ تعلقات میں سرد مہری آ گئی اور امریکی سی آئی اے کو یہ مشن سونپ دیا گیا کہ پاکستان میں بھٹو کی حکومت کو غیر مستحکم کر کے Non-Bhuttoo حکومت کے قیام کو یقینی بنایا جائے۔ 31 اکتوبر 1974ء کو امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر نے بھٹو کو نیوکلیئر پروگرام بند کرنے کا مشورہ دیا اور انھیں دھمکی دی کہ اگر پاکستان نے ایٹمی پروگرام ترک نہ کیا تو اس کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ ایک بین الاقوامی سازش کے تحت متحدہ پاکستان کے دونوں مقبول سیاستدانوں (بھٹو اور مجیب) کا قتل ضروری تصور کیا گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن تو 15 اگست 1975ء کو ایک فوجی بغاوت میں قتل کر دیے گئے تاہم بھٹو کے خلاف ہونے والی بغاوتوں کو متعدد مرتبہ سر اٹھانے سے پہلے ہی دبا دیا گیا۔ 29 فروری 1976ء کو ٹکا خاں کی ریٹائرمنٹ کے بعد ضیاء الحق کو فوج کا نیا سربراہ بنا دیا گیا جس کے بعد بھٹو نے عام انتخابات کرانے کے لیے اپنے ساتھیوں سے صلاح و مشورے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے 76-1975ء کے دوران ڈاکٹر عبدالقدیر کی خواہش کے مطابق پاکستانی سفارتخانوں اور بین الاقوامی سمگلروں کے ذریعے ایٹمی پرزوں کی خریداری کا سلسلہ جاری رکھا جس کی خبر سی آئی اے کو بھی مل گئی جس کے باعث 10 اگست 1976ء کو جب ہنری کسنجر نے دوبارہ بھٹو سے ملاقات کی تو انھوں نے اپنی پرانی دھمکی کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر انھوں نے ایٹمی پروگرام ترک نہ کیا تو ان کے ذریعے ایک بھیانک مثال بنا دی جائے گی۔ 3 نومبر 1976ء کو جمی کارٹر امریکا کے صدر منتخب ہوگئے۔ بھٹو کو بھی احساس ہوگیا تھا کہ امریکا ان پر وار کرے گا اس لیے انھوں نے 1978ء میں انتخابات کرانے کے بجائے مارچ 1977ء میں

www.bhutto.org

انتخابات کرانے کا اعلان کردیا۔ عوامی اور فوجی حمایت حاصل کرنے کے لیے بھٹو نے انتخابات سے قبل کئی اقدامات کیے۔ 6 جنوری 1977ء کو بھٹو لاڑکانہ سے بلا مقابلہ منتخب ہوگئے جب کہ 31 جنوری 1977ء کو ضیاء الحق نے پہلی مرتبہ مسلح افواج کا جشن منایا۔ 7 مارچ 1977ء کو ہونے والے عام انتخابات میں بھٹو کو واضح کامیابی حاصل ہوگئی لیکن پاکستان قومی اتحاد نے انتخابات کے نتائج مسترد کردیے اور ملک میں احتجاجی تحریک شروع کردی۔ امریکی سی آئی اے نے قبل ازیں بنگلہ دیشی عوام میں یہ بات پھیلانے کی کوشش کی کہ شیخ مجیب کے قتل میں بھٹو کا ہاتھ ہے جنھوں نے کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری عبدالحق کی درخواست پر شیخ مجیب الرحمٰن کو قتل کروانے کے لیے بھاری رقوم اور اسلحہ فراہم کیا تھا۔ اس الزام کا مقصد بھٹو کو بین الاقوامی دہشت گرد ثابت کرنا تھا۔ تاہم بھٹو سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے عوامی اتحاد کی احتجاجی تحریک کو روکنے میں سنجیدگی سے کام نہ لیا اور جب حالات خراب ہوگئے اور اسلامی ممالک نے اپوزیشن اور حکومت کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی تو بھٹو مذاکرات کے آخری لمحات میں جنرل ضیاء الحق کی سازش کا شکار ہوکر اپوزیشن کے ساتھ معاہدے پر دستخط کرنے میں خاصی تاخیر کرگئے۔ جس کے باعث جنرل ضیاء الحق نے 4 اور 5 جولائی 1977ء کی درمیانی شب بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا حالاں کہ ایسا کرنے سے چند گھنٹے قبل ہی انھوں نے بھٹو کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ سابق وزیراعظم اپنی تمام تر ذہانت کے باوجود ضیاء الحق کے گیم پلان کو نہ سمجھ سکے۔ 5 جولائی 1977ء کو ضیاء الحق نے قومی اسمبلی توڑ کر ملک بھر میں مارشل لاء لگا دیا۔ اسی روز صوبائی اسمبلیاں بھی توڑ دی گئیں اور آئین معطل کر دیا گیا۔ ضیاء الحق نے 15 جولائی 1977ء کو مری میں ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی اور وعدہ کیا کہ وہ تمام سیاستدانوں کو جلد ہی رہا کرکے سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دیں گے۔ 27 جولائی 1977ء کو ضیاء الحق نے قوم سے خطاب کے دوران کہا کہ دنیا دیکھ لے گی کہ ضیاء الحق اپنے وعدوں کو پورا کرے گا اور اکتوبر 1977ء میں انتخابات کروا کر اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ اس کے اگلے روز 28 جولائی 1977ء کو ضیاء الحق نے دوبارہ مفتی محمود اور بھٹو سے مذاکرات کیے اور دونوں سیاسی رہنماؤں کو خوشخبری سنائی کہ ''میں سیاستدانوں کو رہا کر رہا ہوں۔'' دیگر سیاستدانوں کی طرح بھٹو کو بھی 28 جولائی 1977ء کو رہا کر دیا گیا۔ یکم اگست 1977ء کو ضیاء الحق نے محدود

www.bhutto.org

پیمانے پر سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی لیکن 4/اگست 1977ء کو فوج نے پولیس کے ذریعے ایف ایس ایف کے تین اہلکاروں کو نواب محمد احمد خاں کے مقدمہ قتل کی تفتیش کے سلسلے میں گرفتار کر لیا۔ 24 اگست 1977ء کو الیکشن کمیشن نے بھٹو کو تلوار اور قومی اتحاد کو ہل کا انتخابی نشان الاٹ کر دیا۔ بھٹو نے 27 اگست 1977ء کو ضیاء الحق سے ملاقات کی اور کہا کہ اکتوبر 1977ء میں انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنانے کے لیے ان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کرنے کے لیے تیار رہیں۔ ضیاء الحق اور بھٹو کے درمیان ہونے والی اس ملاقات کے تین دن بعد تمام اپوزیشن جماعتوں نے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ ''بھٹو کو گرفتار کر کے ان پر غداری کا مقدمہ چلایا جائے۔'' جولائی 1977ء سے 2 ستمبر 1977ء کے درمیان ضیاء الحق نے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت بین الاقوامی سطح پر یہ تاثر دیا کہ وہ انتخابات کروا کے اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کرنے کے وعدے پر قائم ہیں۔ حالاں کہ ضیاء الحق شروع دن ہی سے الیکشن نہ کرانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ بھٹو کے خلاف اپوزیشن جماعتوں کا تعاون حاصل کرنے کے لیے ضیاء الحق نے جنرل فیض علی چشتی کے ذریعے تمام بھٹو مخالف سیاستدانوں کو یہ تاثر دیا کہ اگر بھٹو کو گرفتار نہ کیا گیا تو وہ دوبارہ الیکشن جیت جائیں گے۔ ضیاء الحق کا یہ حربہ کارگر ثابت ہوا اور اپوزیشن نے انتخابات کے بجائے بھٹو کو پھانسی دلوانے میں زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دی۔ نتیجتاً 3 ستمبر 1977ء کو فوج نے بھٹو کو 70 کلفٹن سے گرفتار کر کے لاہور منتقل کر دیا۔ بھٹو کی گرفتاری احمد رضا قصوری کے والد نواب محمد احمد خاں کے قتل کے سلسلے میں عمل میں آئی۔ بیگم نصرت بھٹو اور صرف چند ایک دوسرے سیاستدان ہی جانتے تھے کہ ذوالفقار علی بھٹو یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ انتخابات کے بعد اگر حکومت انھیں مل گئی تو وہ ضیاء الحق کو آئین منسوخ کرنے کے جرم میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیں گے۔ بھٹو کی گرفتاری کے بعد بیگم بھٹو اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں اور 22 ستمبر 1977ء کو انھوں نے اعلان کر دیا کہ اکتوبر 1977ء میں ہونے والے انتخابات میں کامیابی کے بعد ہم ضیاء الحق کو ریٹائر کر دیں گے۔ جنرل ضیاء الحق نے بیگم صاحبہ کے بیان کے بعد ہنگامی بنیادوں پر جرنیلوں سے مشورے کر کے سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس یعقوب علی خاں کو فارغ کر دیا کیوں کہ وہ مارشل لاء کے نفاذ کو غیر آئینی قرار دینے کے لیے ایک اہم رٹ پٹیشن کی سماعت کرنے والے تھے۔ یہ رٹ پٹیشن بیگم بھٹو نے دائر کی تھی۔

www.bhutto.org

29 ستمبر 1977ء کو بے نظیر بھٹو نے اوکاڑہ میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اگر ان کے والد کو پھانسی دی گئی تو پانچوں کی دریاؤں کا پانی سرخ ہو جائے گا۔ ضیاء الحق نے بے نظیر بھٹو کے اس بیان کے بعد انھیں نظر بند کرنے کے احکامات جاری کر دیے۔ جب کہ یکم اکتوبر 1977ء کو انتخابات ملتوی کر دیے گئے۔ 9/اکتوبر 1977ء کو نواب محمد احمد خاں کے مقدمہ قتل میں بھٹو کی ضمانت منسوخ کر دی گئی۔ یہ فیصلہ دینے والے جج کا نام مولوی مشتاق حسین تھا۔ (جنھوں نے بعد ازاں انھیں پھانسی کی سزا سنائی)۔ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف بعد ازاں جو جال بنا گیا اسکے تحت 18 اکتوبر 1977ء کو ایف ایس ایف کے سابق ڈائریکٹر جنرل اور مقدمہ قتل میں وعدہ معاف گواہ مسعود محمود نے ہائی کورٹ کو بتایا کہ نواز محمد احمد خاں کو قتل کرنے کا حکم انھیں بھٹو نے دیا تھا۔ بھٹو نے 21 اکتوبر 1977ء کو سپریم کورٹ میں بیان دیا کہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے شخص کو فوج کا سربراہ بنانا ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ بھٹو نے مقدمہ قتل میں 25 جنوری 1978ء کو بند کمرے میں اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ 16 مارچ 1978ء کو بے نظیر بھٹو نے کہا کہ ہائی کورٹ ان کے والد کو پھانسی کی سزا سنانے والی ہے۔ دو روز بعد بھٹو کو سزائے موت دی گئی۔ 25 مارچ 1978ء کو ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔ یکم اپریل 1978ء کو سپریم کورٹ نے اپیل کی سماعت شروع کی۔ 18 مئی 1978ء کو بھٹو کو بذریعہ ہیلی کاپٹر کوٹ لکھپت لاہور سے ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی منتقل کر دیا گیا جس کے بعد قومی اتحاد کے نمائندوں کی ضیاء الحق کے ساتھ ملاقاتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ 5 جولائی 1978ء کو ضیاء الحق نے 22 رکنی کابینہ کا اعلان کیا جس میں سیاسی جماعتوں کے نمائندے بھی شامل تھے۔ 16 ستمبر 1978ء کو فضل الٰہی چودھری کو صدارت کے عہدہ سے فارغ کر کے ضیاء الحق خود صدر بن گئے، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ بھٹو کو پھانسی دینے کے خلاف اپیل صدر کے پاس ہی جائے گی۔ 23 دسمبر 1978ء کو اپیل کی سماعت مکمل ہوئی اور سپریم کورٹ نے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا۔ 5 فروری 1979ء کو حکومت نے اچانک تعلیمی اداروں کو غیر معینہ عرصہ کے لیے بند کر دیا جس کی محض وجہ یہ تھی کہ ضیاء الحق کو سپریم کورٹ کا فیصلہ مل چکا تھا جس میں ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے بھٹو کو پھانسی کی سزا دینے کا حکم درج تھا۔ سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ 6 فروری 1979ء کو سنایا۔ جس کے بعد دنیا بھر سے بھٹو کی

www.bhutto.org

جان بخشوانے کے لیے قیاء الحق کے پاس اپیلیں آنا شروع ہوگئیں۔ 8 مارچ 1979ء کو ضیاء الحق نے بھٹو کی پہلی بیگم امیر بیگم کی ان کے شوہر سے ملاقات کرائی اور 23 مارچ 1979ء کو ضیاء الحق نے انتخابات کے لیے ایک اور تاریخ (17 نومبر) کا اعلان کردیا۔ 24 مارچ 1979ء کو سپریم کورٹ نے بھٹو کے وکیل کی طرف سے پھانسی کے فیصلے پر نظر ثانی کی درخواست بھی مسترد کر دی۔ 26 مارچ 1979ء کو بیگم بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی۔

3/اپریل 1979 کو بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کی ذوالفقار علی بھٹو سے آخری ملاقات کرائی گئی جو 3 گھنٹے جاری رہی۔ اسی روز ضیاء الحق نے بھٹو کو پھانسی دینے کے فیصلے کی توثیق کردی اور 4/اپریل 1979ء کو سپیدہ سحر نمودار ہونے سے پہلے سابق وزیراعظم کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ اسی روز بھٹو کی میت لاڑکانہ بھیجی گئی جہاں 10 بجے ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور ساڑھے 10 بجے انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو ذوالفقار علی بھٹو کا آخری دیدار کرنے کی بھی اجازت نہ دی گئی۔ تاہم 6/اپریل 1979ء کو فوج کے پہرے میں بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو ایک خصوصی طیارے کے ذریعے ان کے آبائی گاؤں رتو ڈیرو جانے کی اجازت ملی۔ بھٹو خاندان کی دونوں خواتین نے بھٹو کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ مگر انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ جس سازش کے تحت بھٹو کو پھانسی دی گئی ہے اس پر عمل درآمد ابھی ختم نہیں ہوا اور اس سازش کے اگلے مرحلے میں شاہ نواز کو 1985ء اور مرتضٰی کو 1996ء میں قتل کے بعد بھٹو کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا اور یہ دونوں خواتین ہی جنازے اٹھانے کے لیے باقی رہ گئیں۔

www.bhutto.org

بھٹو کا قتل

4/اپریل 1979ء کی شام قدرے خوشگوار تھی کیوں کہ دن میں پڑنے والی گرمی سے گھبرائے ہوئے لوگ خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے بہت ہی کم لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ یہ شب بھٹو خاندان کے لیے بہت بھاری ہوگی کیوں کہ مارشل لاء حکومت نے نواب محمد احمد خاں کو قتل کروانے کے الزام میں اس رات بھٹو کو تختہ دار پر لٹکانا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کو 4 اور 5 جولائی 1979ء کی شب مارشل لاء لگنے کے بعد زیر حراست لیا گیا تھا اور اس کے کچھ عرصہ بعد انھیں نواب محمد احمد خاں کو قتل کرنے کے جرم میں گرفتار کیا گیا۔ مولوی مشتاق حسین ہائی کورٹ کے اس فل بنچ کے سربراہ تھے جس نے بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی۔ یہ وہی مولوی مشتاق حسین ہیں جو چوہدری ظہور الٰہی کی کار پر ہونے والی فائرنگ کے دوران زخمی ہوگئے تھے جب کہ چوہدری ظہور الٰہی اور ان کا ڈرائیور نسیم اس حملے میں ہلاک ہوگئے بیگم نصرت بھٹو کو فروری 1978ء میں ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ اُن کے شوہر کو زندہ نہیں چھوڑا جائے گا 3 فروری 1978ء کو پیپلز پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر اب پی پی پی کے جانثار کارکنوں کو میدان میں نہ لایا گیا تو وقت تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بیگم نصرت بھٹو کو 100 فیصد یقین تھا کہ اگر ضیاء الحق نے 1978ء میں انتخابات کروا دیے اور اقتدار کسی سیاسی جماعت (خواہ وہ پی پی پی مخالف جماعت ہی کیوں نہ ہو) کو منتقل ہوگیا تو نہ صرف بھٹو کی جان بچ جائے گی بلکہ اس سے جمہوری ادارے بھی تباہی سے محفوظ ہوجائیں گے۔ یہ وہی ایام ہیں جب جنرل ضیاء الحق مرحوم نے الیکشن کرانے کا جھانسہ دے کر بھٹو مخالف قوتوں کو اپنا ہمنوا بنا رکھا تھا اور اس بات کی توقع کی جارہی تھی کہ آنے والے چند ماہ کے اندر ملک بھر میں انتخابی

www.bhutto.org

سرگرمیاں شروع ہو جائیں گی۔ بیگم نصرت بھٹو نے 3 فروری 1978ء کو ضیاء الحق سے مطالبہ کیا کہ وہ 2 ماہ کے اندر انتخابات کرائیں۔ ضیاء الحق نے بیگم صاحبہ کے مطالبے کا بنظر غائر جائزہ لیا اور سیاستدانوں کی آمدن کے گوشواروں کی چھان بین کرنے والے سرکاری حکام نے 89 سیاسی رہنماؤں کے معاملات نااہل قرار دینے والے ٹریبونل کے حوالے کر دیے۔ بیگم نصرت بھٹو کا اس ضمن میں نام سرفہرست تھا۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ جنرل ضیاء الحق کی سربراہی میں 1977ء کو بننے والی فوجی حکومت بھٹو خاندان کو سیاست سے آؤٹ کرنا چاہتی ہے۔ ان حالات میں جب ذوالفقار علی بھٹو پابند سلاسل تھے اور فوجی جنتا یہ طے کر چکی تھی کہ بیگم نصرت بھٹو کو سیاسی عمل سے دور رکھنا ہے تو بھٹو کے لیے سوائے اس بات کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی صاحبزادی بے نظیر بھٹو کو میدان میں لاتے۔ اس سلسلے میں بھٹو مرحوم نے اپنے وکیل یحییٰ بختیار کے ذریعے اپنی اہلیہ کو پیغام دیا کہ وہ ''پنکی'' (بے نظیر) کو سیاسی دورے کروائیں۔ چنانچہ بھٹو مرحوم کی ہدایات کی روشنی میں بے نظیر بھٹو نے 14 فروری 1978ء کو سندھ کے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ چوں کہ حکومت کی طرف سے عوامی اجتماعات سے خطابات پر پابندی تھی اس لیے بے نظیر نے اپنے اس دورے کے دوران چار دیواری کے اندر اجتماعات سے خطاب کیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے 14 فروری سے 17 فروری 1978ء تک قدرے صبر سے کام لیا کیوں کہ انھیں آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جینس سے بھٹو خاندان کی سیاسی سرگرمیوں کی مسلسل تفصیلات مل رہی تھیں اور ان انٹیلی جینس رپورٹس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگر بے نظیر بھٹو کو فوری طور پر گرفتار نہ کیا گیا تو وہ عوام کو مشتعل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ بے نظیر بھٹو کے دورۂ سندھ سے ذوالفقار علی بھٹو کو بھی باخبر رکھا جا رہا تھا۔ بھٹو کو 18 فروری 1978ء کا بے چینی سے انتظار تھا کیوں کہ اس روز بے نظیر نے سندھ کے ایک اہم علاقے نواب شاہ میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کا منصوبہ بنا رکھا تھا لیکن ایک روز قبل ہی فوجی حکام نے انھیں سندھ سے کراچی بھیج دیا اور ان کو سختی سے کہا گیا کہ وہ کراچی کی شہری حدود سے باہر نہ نکلیں۔

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی گرفتاری کے بعد کچھ عرصہ تک تو سیاسی سرگرمیوں پر پابندی رہی لیکن سیاستدانوں کی رہائی کے بعد عوام کے دلوں سے مارشل لاء کا خوف نکلنا شروع ہو گیا کیوں کہ ضیاء الحق نے سیاستدانوں کو قدرے چھوٹ دے رکھی تھی اور وہ یہ تاثر

www.bhutto.org

دیے ہوئے تھے کہ ان کا اقتدار سے چمٹے رہنے کا کوئی ارادہ نہیں اور مناسب وقت پر انتخابات کروائیں جائیں گے۔ فوج اور سول کی انٹیلی جینس ایجنسیوں کے ذریعے آرمی ہاؤس پہنچنے والی انٹیلی جینس رپورٹس سے فروری 1978ء میں ہی واضح ہوگیا تھا کہ عوام کی بڑی تعداد اب بھی بھٹو خاندان، خصوصاً ذوالفقار علی بھٹو سے محبت کرتی ہے اور انتخابات کے انعقاد کے بعد اگر پی.پی.پی اکثریتی جماعت، کے طور پر سامنے بھی آسکی تو بہر حال اسے مرکز اور صوبوں میں اس قدر نشستیں ضرور مل جائیں گی کہ وہ حکمران وقت کو بلیک میل کر سکے۔ اس صورت حالات کو دیکھتے ہوئے ضیاء الحق نے 22 فروری 1978ء کو سبی میں عوامی اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ان کی حکومت اس وقت انتخابات کروائے گی جب وہ اور ان کے ساتھی مثبت نتائج کے بارے میں پُر یقین ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ ''مثبت نتائج'' سے ضیاء الحق کی مراد ان جماعتوں کی کامیابی تھی جن کی وہ سرپرستی کر رہے تھے۔ جنرل محمد ضیاء الحق 1978ء میں ''نان بھٹو'' یعنی بھٹو خاندان کے بغیر بننے والی حکومت کے بارے میں اپنے رفقاء سے صلاح مشورے میں مصروف رہے۔ ان کی کافی حد تک مشکل خود بھٹو نے آسان کر دی تھی کیوں کہ اپنے دیرینہ ساتھیوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے بھٹو نے اپنی اہلیہ اور صاحبزادی کو پی پی پی کی قیادت سونپ دی جس سے سینئر پارٹی لیڈر ناراض ہوگئے۔ خصوصاً غلام مصطفیٰ جتوئی اور مولانا کوثر نیازی نے اس پر سخت احتجاج کیا اور انھوں نے کھل کر اعلان کیا کہ وہ بھٹو خاندان کی قدر ضرور کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ایک خاندان کی اجارہ داری کو تسلیم کر لیا جائے۔ صرف جتوئی اور کوثر نیازی ہی ان میں شامل نہ تھے جو بھٹو کی جگہ لینے کے لیے بے چین تھے بلکہ اس فہرست میں عبدالحفیظ پیرزادہ، معراج محمد خاں، ملک معراج خالد اور غلام مصطفیٰ کھر بھی شامل تھے۔ مولانا کوثر نیازی نے 24 فروری 1978ء کو بیگم نصرت بھٹو کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی صاحبزادی بے نظیر کو پارٹی پر مسلط کرنے کی روش ترک کر دیں کیوں کہ یہ پارٹی کے لیے تباہ کن ہوگا لیکن اپنے خاوند سے مشورے کے بعد بیگم نصرت بھٹو نے پارٹی کے سینئر رہنماؤں کے احتجاج کو مسترد کر دیا۔

چوں کہ فروری 1978ء میں سیاسی حلقوں میں یہ بات پھیل چکی تھی کہ مولوی مشتاق حسین مارچ 1978ء میں بھٹو کو سزا سنانے والے ہیں، لہٰذا 8 مارچ 1978ء کو پہلے

www.bhutto.org

مرحلے پر پی پی پی کی صوبائی لیڈر شپ کو گرفتار کر لیا گیا جب کہ بیگم نصرت بھٹو کو لاہور میں 12 مارچ 1978ء کو حراست میں لیا گیا۔ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے بھٹو کو پھانسی دینے کا فیصلہ 16 مارچ 1978ء کو ہی لکھ لیا تھا اور 17 مارچ 1978ء کو ہائی کورٹ کا یہ لکھا ہوا فیصلہ آرمی ہاؤس میں ضیاء الحق کی ٹیبل پر موجود تھا۔ نواب محمد احمد خاں قتل کیس کی سماعت مکمل ہونے پر بے نظیر بھٹو نے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ مولوی مشتاق حسین ان کے والد کو سزائے موت دینا چاہتے ہیں اور ان کے یہ خدشات 18 مارچ 1978ء کی صبح 8 بج کر 20 منٹ پر اس وقت درست ثابت ہوئے جب بھٹو کو نواب محمد احمد خاں کے قتل کا مجرم قرار دے کر موت کی سزا سنا دی گئی۔ بیگم نصرت بھٹو 18 مارچ 1978ء کو لاہور کی ایک کوٹھی میں نظر بند تھیں اور اپنے شوہر کو سنائی جانے والی سزا ان پر بجلی بن کر گری۔ لیکن انھیں یقین تھا کہ اگر ہائی کورٹ میں ان کے ساتھ انصاف نہ ہوا تو سپریم کورٹ ان کے ساتھ انصاف کرے گی۔ اس کے علاوہ بیگم نصرت کو اپنے دونوں صاحبزادوں کی کوششوں سے بھی کافی تسلی تھی جو مسلسل اسلامی ممالک کے دورے پر تھے اور اپنے والد کی جان بچانے کے لیے اسلامی ممالک کے سربراہوں کے ذریعے ضیاء الحق پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائے جانے کے چند گھنٹوں کے اندر ہی ملک بھر سے سینکڑوں کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا جب کہ بھٹو کو 19 مارچ 1978ء کو پھانسی کی کوٹھری میں منتقل کر دیا گیا۔ بیگم نصرت بھٹو نے خود کو اس وقت بہت تنہا محسوس کیا کیوں کہ فوجی حکومت نے ان کی صاحبزادی کو 70 کلفٹن میں نظر بند کر رکھا تھا جب کہ ان کے دونوں صاحبزادے مرتضیٰ اور شاہ نواز دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ ''میں اپنے والد سے ملاقات کرنا چاہتی ہوں، مجھے جلد از جلد لاہور شفٹ کیا جائے'' بے نظیر بھٹو نے 70 کلفٹن سے فوجی حکام کو 20 مارچ 1978ء کو ایک درخواست بھجوائی۔ سندھ کے ہوم سیکرٹری نے بے نظیر کی یہ درخواست 21 مارچ 1978ء کو ضیاء الحق کے پاس بھیج دی یہ پہلا موقع تھا کہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد بے نظیر بھٹو کی درخواست ان کے سامنے آئی تھی۔ ضیاء الحق دو روز تک فیصلہ نہ کر پائے کہ بے نظیر بھٹو کو کراچی سے لاہور منتقل کیا جائے یا نہیں کیوں کہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی۔ کافی سوچ و بچار کے بعد ضیاء الحق نے بے نظیر کو اپنے والد سے ملاقات کی اجازت دے دی جنھیں ایک طیارے کے ذریعے 25 مارچ 1978ء کی صبح

www.bhutto.org

کراچی سے لاہور لایا گیا اور اسی روز ان کی بھٹو سے ملاقات ہوئی۔ بھٹو مرحوم نے 25 مارچ 1978ء کو بے نظیر بھٹو کو اپنا جانشین مقرر کیا اور انھیں سیاسی امور کے بارے میں اپنے تجربے کی روشنی میں گائیڈ کیا۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے والد کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا کہ یحییٰ بختیار اور ان کے رفقاء آج (25 مارچ) سپریم کورٹ میں لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر رہے ہیں۔ بے نظیر کو اسی روز کراچی بھیج دیا گیا۔ سپریم کورٹ نے بھٹو کی درخواست پر یکم اپریل 1978ء کو مقدمے کی سماعت شروع کی۔ یہ وہ ایام ہیں جب بیگم نصرت بھٹو لاہور اور بے نظیر کراچی میں نظر بند تھیں اور انھیں ہر وقت یہی خدشہ رہتا تھا کہ کہیں بھٹو کو تختہ دار پر نہ لٹکا دیا جائے۔ فوج کی تمام تر نگرانی کے باوجود شاہ نواز اور مرتضیٰ کا دمشق سے کسی نہ کسی طرح کوئی نہ کوئی پیغام بیگم نصرت بھٹو یا بے نظیر تک پہنچ ہی جایا کرتا تھا اور ان پیغامات سے ماں بیٹی کو کافی تسلی ہوتی تھی۔ مرتضیٰ بھٹو نے 1977ء کے بعد افغانستان، لیبیا، شام، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور دیگر اسلامی ممالک کا متعدد مرتبہ دورہ کیا۔ ان کے یہ دورے خاصے کامیاب رہے کیوں کہ اسلامی ممالک کی انٹیلی جینس ایجنسیوں اور حکومتوں نے انھیں ہر قسم کی مدد فراہم کی۔ مرتضیٰ کا منصوبہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح کوٹ لکھپت جیل لاہور سے ان کے والد کو جیل توڑ کر آزاد کروالیا جائے۔ لیکن ان کے یہ منصوبے قبل از وقت ہی فوجی حکام تک پہنچ گئے اور بھٹو کو 18 مئی 1978ء کو کوٹ لکھپت جیل سے ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی منتقل کر دیا گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دست راست مولانا کوثر نیازی اور کمال اظفر (جنھیں ان کی خدمات کے اعتراف میں بے نظیر بھٹو نے بعد ازاں 96-1993ء میں سندھ کا گورنر بنایا) ان ایام میں جنرل محمد ضیاء الحق کے زیر اثر تھے اور پاکستان پیپلز پارٹی کو ہائی جیک کرنے کے لیے انھوں نے 19 مئی 1978ء کو پی پی پی کی وہ تنظیم توڑ دی جو بھٹو نے قائم کی تھی اور پارٹی کی تنظیم نو کر کے مولانا کوثر نیازی کو اس کا چیئرمین اور کمال اظفر کو سیکریٹری جنرل چن لیا گیا۔ اسی روز مولانا کوثر نیازی نے جنرل ضیاء الحق سے بھی ملاقات کی گویا حکومتی حلقوں کی طرف سے بھرپور کوشش کی گئی کہ کسی نہ کسی طرح پی پی پی کو بھٹو خاندان کے تسلط سے آزاد کروا لیا جائے۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر ابھی تک نظر بند تھیں اور انھیں گھر کی چار دیواری میں قید کرنے کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہ تھا کہ ''نان بھٹو'' قیادت کو سامنے لا کر عوام کو تاثر دیا جائے کہ پیپلز پارٹی پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ

www.bhutto.org

لینے پر کوئی پابند نہیں ہے۔ بیگم نصرت بھٹو اور ان کی صاحبزادی اس ساری صورت حالات کو انتہائی بے بسی سے دیکھ رہی تھیں اور انھوں نے جیل حکام کو متعدد مرتبہ درخواست دی کہ وہ بھٹو سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔ جس کے بعد بے نظیر کو 2 جون 1978ء کی صبح کراچی سے راولپنڈی لایا گیا جہاں بھٹو نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ وہ پارٹی کی تنظیم نو کے لیے منصوبہ بندی کرتی رہیں کیوں کہ مولانا کوثر نیازی وغیرہ پارٹی کو کنٹرول کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ جیل حکام نے 5 جون 1978ء کو بیگم نصرت بھٹو کے پاس بعض ایسے پیغامات بھیجے جو انھیں مرتضٰی اور شاہ نواز نے اپنے جانثار ساتھیوں کے ذریعے فوجی حکام کی آنکھوں میں دھول ڈال کر ان تک پہنچائے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو جیل پہنچیں تو فوجی انتظامیہ نے ان کی تلاشی لینے کی کوشش کی۔ جس پر وہ غصے میں آ گئیں کیوں کہ تلاشی لیے جانے کی صورت میں بہت سے راز فاش ہو سکتے تھے، لہٰذا انھوں نے بہتر یہی سمجھا کہ شوہر سے ملاقات ہی نہ کی جائے۔ مرتضٰی بھٹو کا بیرون ملک سے ان ایام میں راؤ رشید سے بھی رابطہ تھا جنھیں 5 جون 1978ء کو ان کی اہلیہ سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ راؤ رشید اس روز ڈسٹرکٹ جیل اٹک بھیج دیے گئے۔

بے نظیر بھٹو نے اس صورت حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی نظر بندی کو ہائی کورٹ میں چیلنج کر دیا۔ خوش قسمتی سے ان کی درخواست کی سماعت جسٹس فخر الدین جی ابراہیم اور جسٹس جمال میاں پر مشتمل بنچ نے کی۔ جسٹس فخر الدین جی ابراہیم اور ذوالفقار علی بھٹو پرانے دوست تھے اور دونوں کراچی کے ایک ہی علاقے میں وکالت کرتے رہے تھے۔ دو ججوں پر مشتمل اس بنچ نے 14 جون 1978ء کو بے نظیر کی نظر بندی کو غیر قانونی قرار دے کر انھیں رہا کرنے کا حکم دے دیا۔ جس پر ضیاء الحق نے پی پی پی کی قیادت کا بندوبست کرنے کے ساتھ ساتھ ان ججوں کی فہرست بھی تیار کروالی جو بھٹو یا ان کے خاندان کے ساتھ ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔ ایسے ججوں کو مختلف طریقوں سے انتقامی کارروائی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس کے علاوہ ضیاء الحق نے پاکستان قومی اتحاد کی قیادت کو اقتدار کا جھولا دینے کے لیے شیشے میں اتارنا شروع کر دیا۔ انھوں نے پہلے 16 اور پھر 22 جون 1978ء کو قومی اتحاد کی مرکزی قیادت سے مذاکرات کیے اور ان پر واضح کیا کہ وہ سیاست سے مرحلہ وار پابندیاں اٹھانا چاہتے ہیں۔ لیکن پہلے مرحلے میں سیاستدانوں کو محدود سطح پر سیاسی سرگرمیوں

www.bhutto.org

میں حصہ لینے کی اجازت ہوگی جب کہ دوسرے مرحلے میں انتخابات کی تاریخ کا اعلان ہونے پر تمام سیاستدانوں کو عوامی اجتماعات منعقد کرنے کا حق دے دیا جائے گا۔ پاکستان قومی اتحاد کی مرکزی قیادت دراصل جولائی 1978ء تک کافی حد تک دلبرداشتہ ہو چکی تھی۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ضیاء الحق نے جولائی 1977ء کو مارشل لاء لگاتے وقت وعدہ کیا تھا کہ وہ 90 روز کے اندر انتخابات کروانے کے بعد اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کر دیں گے لیکن جب ایک سال کا عرصہ گذر جانے کے باوجود الیکشن نہ ہو سکے تو جماعت اسلامی، جے یو آئی، تحریک استقلال اور مسلم لیگ سمیت تمام اپوزیشن جماعتیں دلبرداشت ہوگئیں۔ دوسری جانب بیگم نصرت بھٹو اس بات کے لیے کوشاں تھیں کہ کسی نہ کسی طرح ان کی پاکستان قومی اتحاد سے صلح ہو جائے تا کہ ضیاء الحق پر دباؤ ڈال کر مارشل لاء ختم کروا دیا جائے۔

مارشل لاء کی پہلی سالگرہ پر بننے والی اس کابینہ میں درج ذیل زعماء شامل تھے۔ غلام اسحاق خاں، مصطفیٰ کوکل، محمد علی ہوتی، جنرل فیض علی چشتی، جنرل غلام حسن خاں، حبیب اللہ خاں، محمود ہارون، فدا محمد خاں، چوہدری ظہور الٰہی، میاں زاہد سرفراز، خواجہ محمد صفدر، جمال سید میاں، شریف الدین پیزادہ، شہزادہ محی الدین، گل محمد جوگیزئی، اے کے بروہی، محمد خاں جونیجو، محمد رہی، جاوید ہاشمی، آغا شاہی، بیگم وقار النساء نون اور ایم ڈی حبیب، لیکن قومی اتحاد کے چوٹی کے رہنما کابینہ میں شامل نہ ہوئے۔ 8 جولائی 1978ء کو بیگم نصرت بھٹو نے راولپنڈی میں اپنے شوہر سے جیل کی کوٹھری میں ملاقات کی۔ بھٹو نے اپنی اہلیہ کو بتایا کہ وہ اپنے وکلاء کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں۔ 24 جولائی 1978ء کو جب سپریم کورٹ میں بھٹو کی اپیل پر مقدمے کی سماعت جاری تھی، حکومت نے قرطاس ابیض جاری کر دیا جس کا مقصد بھٹو کو بدعنوان اور ظالم ثابت کرنا تھا۔ پاکستان قومی اتحاد میں شامل جماعتوں میں سے اکثریت نے 5 جولائی 1978ء کو بننے والی کابینہ میں محض اس لیے شمولیت اختیار نہیں کی تھی کہ ضیاء الحق جرنیلوں کو بھی کابینہ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس دوران ضیاء الحق کا تختہ الٹنے کے لیے سازش بھی ہوئی اور انھیں یہ بھی پتا چلا کہ بعض جرنیل حکومتی عہدوں کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کے خلاف ایک گروپ قائم کر رہے ہیں۔ چنانچہ ضیاء الحق نے بھٹو کو پھانسی دینے سے قبل سیاستدانوں کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے 23 اگست

www.bhutto.org

1978ء کو مکمل طور پر سول کابینہ کا اعلان کر دیا اور اس موقع پر انھوں نے کہا کہ نئے انتخابات اکتوبر 1979ء تک کروا دیے جائیں گے۔ جنرل محمد ضیاء الحق کی دراصل یہ بھی ایک چال تھی۔ وہ بھٹو کو پھانسی دینے تک سیاستدانوں کی مخالفت مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ضیاء الحق نے غلام مصطفیٰ جتوئی کو پیغامات بھجوانے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ جتوئی ان دنوں بھٹو سے سخت نالاں تھے کیوں کہ 25 سالہ بے نظیر بھٹو نے پیپلز پارٹی کی مرکزی مجلس عاملہ کے اجلاسوں کی صدارت کرنا شروع کر دی تھی اور اس کے علاوہ پارٹی کی شریک چیئر پرسن بن چکی تھیں۔ مولانا کوثر نیازی نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ جتوئی ان کے ساتھ مل جائیں لیکن سیاسی امور سے قدرے زیادہ آگاہ ہونے کے باعث جتوئی نے فوری طور پر بھٹو کی مخالفت مول نہ لی مگر ستمبر 1978ء میں جب بے نظیر نے سیاسی آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سرحد کا دورہ کیا تو ضیاء الحق نے ایک نیا مارشل لاء آرڈر جاری کیا جس کے تحت سیاسی جماعتوں کو تنبیہہ کی گئی کہ وہ سیاسی سرگرمیوں میں صرف اس وقت حصہ لیں جب ان کی مرکزی مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا ہو اور اس قسم کے اجلاسوں کا بند کمروں میں انعقاد ضروری قرار دے دیا گیا۔ جتوئی نے دو مرتبہ بھٹو کو جیل میں پیغام بھیجا کہ وہ انھیں پارٹی کو آرگنائز کرنے کا موقع دیں لیکن بھٹو نے ایسا نہ کیا جس پر جتوئی نے 15 ستمبر 1978ء کو پی پی پی سندھ کے صوبائی صدر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا واریہی وہ شام تھی جب ضیاء الحق نے فضل الٰہی چوہدری کی جگہ 16 ستمبر 1978ء کو پاکستان کا صدر بننے کی تیاریاں مکمل کر رکھی تھیں۔ ضیاء الحق کو دراصل خدشہ تھا کہ اگر سپریم کورٹ نے بھٹو کو دی جانے والی پھانسی کی سزا برقرار رکھی اور اس کے بعد بھٹو خاندان نے رحم کی اپیل دار کی تو کہیں فضل الٰہی چوہدری بھٹو کو دی جانے والی سزائے موت معاف نہ کر دیں۔ مستقبل پر نظر رکھنے والے ضیاء الحق نے اس طرح 16 ستمبر 1978ء کو جب صدر مملکت کا عہدہ سنبھالا تو صورت حالات یہ تھی کہ محترمہ بے نظیر بھٹو سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھیں۔ سردار فاروق احمد خاں لغاری ان کے جانثار ساتھیوں میں شامل تھے اور 24 ستمبر 1978ء کو لغاری ہاؤس میں پارٹی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے بے نظیر بھٹو نے انکشاف کیا کہ راولپنڈی جیل میں دورانِ ملاقات ایک مرتبہ ان کے والد نے قرآن پاک پر مجھ سے حلف لیا تھا کہ میں ملک کے وسیع تر مفاد میں پارٹی کی قیادت سنبھال کر مارشل لاء کے خلاف جدوجہد جاری رکھوں

www.bhutto.org

گی۔ اگرچہ بے نظیر بھٹو نے آنے والے دنوں میں اپنے دیرینہ ساتھیوں کو نظر انداز کر کے مارشل لاء کے حامی عناصر کو پارٹی میں اہم عہدوں سے نوازا لیکن 1978ء میں صورت حالات یہ تھی کہ پی پی پی کے رہنما اور کارکن حکومت کی سخت ہدایات کے باوجود ان کے اعزاز میں تقریبات کا اہتمام کرتے اور شاید ہی کوئی ایسا میزبان ہو جس کو حکومت نے جرمانہ یا سزا نہ دی ہو۔ 14 اکتوبر 1978ء کو جب بے نظیر پنجاب کے دورے پر تھیں، مارشل لاء حکام نے انھیں گرفتار کر لیا جب کہ ساتھ ہی سردار فاروق لغاری اور ڈاکٹر غلام حسین بھی دھر لیے گئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بے نظیر 15/اکتوبر 1978ء کو مارشل لاء کے خلاف عوامی جدوجہد کا آغاز کرنے والی تھیں۔ اگرچہ بے نظیر بھٹو جانتی تھیں کہ جتوئی اور کوثر نیازی وغیرہ ان کے لیے زیادہ مشکلات پیدا نہیں کر سکیں گے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود تھی کہ بے نظیر کو پارٹی کے سینئر رہنماؤں کا تعاون حاصل نہ تھا اور مولانا کوثر نیازی نے 3 نومبر 1978ء کو پی پی پی کے دھڑے کا نام پروگریسو پیپلز پارٹی رکھ لیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ ایک طرف ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل زیر التواء تھی۔ جب ہائی کورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ نے بھٹو کیس کی سماعت شروع کی تو فل بنچ میں 9 جج شامل تھے جن میں سے جسٹس قیصر خاں 30 جولائی 1978ء کو ریٹائر ہو گئے جب کہ چیف جسٹس شیخ انوار الحق نے 4 دسمبر 1978ء کو اعلان کیا کہ بنچ میں شامل ایک معزز رکن جسٹس وحید الدین علیل ہیں اور ان کی آواز اور بات میں خرابی اور چال میں لڑکھڑاہٹ ہے اس لیے مقدمے کی سماعت اب 7 جج کریں گے۔ جس پر بھٹو نے راولپنڈی میں کہا کہ ملک کے ایک وزیر اعظم (لیاقت علی خاں) کو اسی شہر میں قتل کر دیا گیا لیکن کسی نے ایف آئی آر تک درج نہ کی جب نواب محمد احمد خاں مقدمہ قتل میں جب کہ کیس داخل دفتر ہو چکا تھا، انھیں ایک جھوٹے مقدمے میں الجھا دیا گیا ہے۔ ''مجھے اب پھانسی بھی دے دی گئی تو مجھے اس کی کوئی فکر نہیں، میں جانتا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا لیکن وقت ثابت کرے گا کہ میں بے گناہ تھا۔'' سپریم کورٹ نے 23 دسمبر 1978ء کو مقدمے کی سماعت مکمل کرنے کے بعد فیصلہ محفوظ کر لیا۔

ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی عادت تھی کہ وہ اپنی سالگرہ کے موقع پر لاڑکانہ میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کرتے تھے جس میں ملکی اور غیر ملکی مہمانوں کو مدعو کیا جاتا۔ بھٹو چوں کہ خود بھی شکار کے شوقین تھے اس لیے وہ خصوصی طور پر اس بات کا اہتمام کرتے کہ ان

www.bhutto.org

کے دوست شکار سے لطف اندوز ہوں۔ لیکن 6 جنوری 1979ء کو ان کی سالگرہ کے موقع پر صورت حالات یکسر طور پر مختلف تھی۔ وہ لاڑکانہ کی شکار گاہوں یا بڑی حویلی کے بجائے پھانسی کی کوٹھری میں بند تھے اور ان کی اہلیہ اور بیٹی کو جیل احکام نے ان کی سالگرہ کے موقع پر ملاقات کی اجازت نہ دی۔ جنرل ضیاء الحق اور عدلیہ کے درمیان ان ایام میں کس قدر خوشگوار تعلقات موجود تھے اس کی ایک مثال مولوی مشتاق حسین اور دوسری جسٹس انوار الحق تھے۔ مولوی مشتاق نے جب بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی تو ضیاء الحق اس فیصلے سے پہلے ہی آگاہ تھے جب کہ شیخ انوار الحق نے 6 فروری 1979ء کو نواب محمد احمد خاں مقدمہ قتل میں لاہور ہائیکورٹ کے فیصلے کے خلاف بھٹو کی اپیل مسترد کرنے کے متعلق جو فیصلہ پڑھ کر سنایا اس سے ضیاء الحق 5 فروری 1979ء کو ہی آگاہ تھے۔ یہاں یہ ہے کہ مارشل لاء حکام نے 5 فروری 1979ء کو ہی بیگم نصرت بھٹو کو نظر بند کر دیا اور ملک بھر کے تمام تعلیمی ادارے تا حکم ثانی بند کر دیے گئے۔ یہ اقدامات کسی طوفان کا پیش خیمہ تھے اور بھٹو خاندان کی خواتین اس سے اچھی طرح آگاہ تھیں۔

بیگم نصرت بھٹو کو جب 6 فروری 1979ء کو اطلاع ملی کہ سپریم کورٹ نے ان کے شوہر کی اپیل مسترد کر دی ہے تو انھوں نے انتہائی جذباتی انداز میں ضیاء الحق کو برا بھلا کہا اور وہ بار بار اپنے چہرے پر تھپڑ مارتی رہیں۔ ان کی اس جذباتی کیفیت سے جنرل ضیاء الحق کو مطلع کیا گیا تو انھوں 7 فروری 1979ء کو جیل حکام کو اس بات کی اجازت دی کہ وہ بیگم نصرت کو بھٹو صاحب کے ساتھ ملاقات کروا دیں۔ 8 فروری 1979ء کو نصرت بھٹو نے اپنے شوہر سے ملاقات کی اور انھیں اس بات پر تیار کیا کہ وہ سپریم کورٹ میں نظر ثانی کی درخواست دائر کریں۔ بھٹو اس بات کے حق میں نہ تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ضیاء الحق نے ججوں کو دباؤ میں ڈال کر فیصلے کروانے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ اس لیے اپیلوں کے ذریعے انھیں انصاف نہیں ملے گا۔ لیکن یحییٰ بختیار کے اصرار پر وہ راضی ہو گئے کیونکہ پی پی پی کی حکمت عملی یہ تھی کہ نظر ثانی کی اپیل دائر کر کے کچھ وقت حاصل کر لیا جائے اور پھر ملکی اور بین الاقوامی حمایت سے ضیاء الحق کو اس بات پر تیار کیا جائے کہ وہ ان کی جان بخشی کر دیں۔ یحییٰ بختیار کو یقین تھا کہ ضیاء الحق عالمی دباؤ کے باعث بھٹو کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیں گے۔ ایک طرف یہ صورت حالات حاصل تھی کہ بھٹو خاندان کے افراد سابق

www.bhutto.org

وزیراعظم کی جان بچانے کے لیے سرتوڑ کوششوں میں مصروف تھے تو دوسری طرف اپوزیشن کا رویہ یہ تھا کہ وہ ضیاء الحق کو مبارکبادیں دینے اور تحفے تقسیم کرنے میں مصروف تھی۔ پیرپگاڑا نے کہا ''بھیڑیئے سے جس قدر جلدی نجات حاصل کر لی جائے، اسی قدر بہتر ہوگا۔'' بےنظیر بھٹو ان دنوں 70 کلفٹن پر نظربند تھیں۔ اس مرتبہ ضیاء الحق نے انھیں اپنے والد سے ملاقات کرنے کی اجازت نہ دی کیوں کہ بھٹو ہر ملاقات میں اپنی صاحبزادی کو سیاسی اسرار و رموز سے آگاہ کرتے تھے۔ البتہ بھٹو کی پہلی بیگم امیر بیگم کو اپنے شوہر سے ملاقات کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ امیر بیگم 8 مارچ 1979ء کو پھانسی کی کوٹھڑی میں اپنے شوہر کے قریب بیٹھ کر زار و قطار روتی رہیں۔ جنرل محمد ضیاء الحق نے 23 مارچ 1979ء کو ٹرنپ کارڈ استعمال کرتے ہوئے کہا کہ عام انتخابات اس سال 17 نومبر 1979ء کو منعقد ہوں گے۔ دراصل اس فیصلے کے ذریعے ضیاء الحق یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ذوالفقارعلی بھٹو کا منظرعام سے ہٹ جانا اپوزیشن کے اپنے حق میں بہتر ہے۔ 24 مارچ 1979ء کو شیخ انوارالحق نے بطور چیف جسٹس سپریم کورٹ محض 10 سیکنڈ میں بھٹو کی نظرثانی کی اپیل کو مسترد کر دیا۔ ججوں کا رویہ اپنی جگہ پر لیکن بھٹو کے وکلاء نے ان کا مقدمہ کس قدر دلچسپی اور جانفشانی سے لڑا اس کی ایک مثال عبدالحفیظ پیرزادہ ہیں۔ جن کا عشق ان دنوں عروج پر تھا، جن دنوں بھٹو پھانسی کی کوٹھڑی میں اپنی زندگی کے فیصلے کے منتظر تھے۔ 24 مارچ 1979ء کو جب سپریم کورٹ نے بھٹو کو دی جانے والی سزائے موت کے فیصلے کو برقرار رکھا تو اس روز عبدالحفیظ پیرزادہ نے نئی شادی کی۔ ذوالفقارعلی بھٹو کو پیرزادہ کی شادی کی خبر بیگم نصرت بھٹو اور بےنظیر سے ملی، جنھوں نے 26 مارچ 1979ء کو ان سے ملاقات کی۔ بھٹو مرحوم کی یہ ملاقات ان تمام ملاقاتوں سے قدرے مختلف تھی جو وہ قبل ازیں اپنے اہل خانہ سے کر چکے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ضیاء الحق انھیں زندگی سے محروم کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے اور انھیں اس بات کا بھی دکھ تھا کہ ان کی میت کو کندھا دینے کے لیے خاندان کی روایات کے برعکس ان کے دونوں صاحبزادے ملک میں موجود نہیں ہوں گے۔ ''مرتضیٰ اور شاہ نواز سے کہو کہ وہ پاکستان نہ آئیں۔'' بھٹو نے اپنی اہلیہ کو مشورہ دیا کیوں کہ شاہ نواز نے مارچ 1979ء میں پاکستان لبریشن آرمی کے نام سے ایک گوریلا تنظیم قائم کر لی تھی جس کے روحِ رواں مرتضیٰ بھٹو تھے۔ ذوالفقارعلی بھٹو جانتے تھے کہ ان کے صاحبزادے جس کام میں

www.bhutto.org

ہاتھ ڈال چکے ہیں وہ خطرناک ہے اور مارشل لاء حکام ان کو نہیں چھوڑیں گے۔ مارشل لاء حکام نے 31 مارچ 1979ء کو بھٹو کی ان کے اہل خانہ کے ساتھ آخری ملاقاتیں کروانے کا سلسلہ شروع کیا اور بھٹو کی بہن شیر بانو امتیاز نے اپنے بھائی کی جان بخشی کے لیے ضیاء الحق سے رحم کی اپیل کردی۔ ضیاء الحق نے یکم اپریل سے 3 اپریل 1979ء تک کا عرصہ انتہائی بے چینی کی کیفیت میں گذارا کیوں کہ بھٹو کو پھانسی دینے کے اقدام سے نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ غیر ملکی سطح پر بھی ردعمل ظاہر ہوسکتا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کی 3 اپریل 1979ء کو بھٹو سے آخری ملاقات کروائی گئی۔ دونوں خواتین جیل میں سنگلاخ سلاخوں کے پیچھے تین گھنٹے تک زار و قطار روتی رہیں اور بھٹو انھیں بار بار حوصلہ دیتے رہے، حالاں کہ مسلسل ذہنی اور جسمانی اذیت کے باعث ان کی اپنی حالت زیادہ بہتر نہ رہی تھی۔ ان کا وزن خاصا کم ہو چکا تھا۔ بھٹو خاندان کے دو افراد (مرتضیٰ اور شاہ نواز) ہزاروں میل دور اس رات جس ذہنی تکلیف اور صدمے سے دوچار تھے اس کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے کیوں کہ کرنل قذافی کے توسط سے انھیں پتا چل چکا تھا کہ آج رات ان کے والد کو پھانسی دے دی جائے گی۔ اسلام آباد کے تمام سفارتخانوں کو 3 اپریل 1979ء کی شام علم تھا کہ ضیاء الحق نے بھٹو کی رحم کی اپیل مسترد کردی ہے اور ان کا انجام قریب ہے اور اس صورت حالات سے اگر کوئی بے خبر تھا تو وہ ''عوام'' تھے..... وہی عوام جو ذوالفقار علی بھٹو کے تاریخی جلسوں اور ان کے خلاف ہونے والے تاریخی مظاہروں میں شرکت کر چکے تھے۔ ضیاء الحق نے 2 اپریل 1979ء کو انٹیلی جینس رپورٹوں کا مطالعہ کیا جو عوام کے متوقع ردعمل کے حوالے سے تیار کی گئی تھیں۔ 3 اپریل 1979ء کی شام لاہور میں اچانک اس وقت بے چینی پھیل گئی جب شہر میں خصوصی ضمیمے فروخت ہونا شروع ہوگئے کہ بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ یہ ضمیمے خصوصی طور پر ریلوے اسٹیشن لاہور، لاری آڈے اور دیگر اہم مقامات پر تقسیم کیے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی کہ بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ہے لیکن قدرے سمجھدار افراد نے اخبارات کے خصوصی ضمیمے کو دیکھ کر اس بات پر ضرور حیرت کی کہ پھانسی تو عموماً صبح سحر سے پہلے دی جاتی ہے، آخر بھٹو کو عشاء کی نماز سے پہلے کیوں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ اس دوران اخبارات میں ٹیلی فون کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئیں کیوں کہ لوگ جاننا چاہتے تھے کہ کیا واقعی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ یہ افواہ پھیلتے پھیلتے

www.bhutto.org

سندھ تک بھی چلی گئی جہاں بھٹو کے چچا میر نبی بخش بھٹو کے پاس ایک سرکاری افسر یہ جاننے کے لیے موجود تھا کہ بھٹو کو کس قبرستان میں دفنایا جائے گا۔ ممتاز بھٹو کے والد میر نبی بخش بھٹو نے بھٹو کی قبر بنانے کے لیے گڑھی خدا بخش کے اس حصے کا انتخاب کیا جہاں بھٹو کے والد اور بھائی وغیرہ دفن تھے۔ اس رات بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر انتہائی بے بسی اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلتی رہیں۔ جوں جوں کلاک کی سوئی 2 بجے کی طرف بڑھ رہی تھی بھٹو کی اہلیہ اور صاحبزادی کا دل ڈوب رہا تھا۔ وہ یہ جانتی تھیں کہ اگلے چند گھنٹے بھٹو کی زندگی کے لیے بھاری ہیں۔ انھیں اب بھی امید تھی کہ کوئی معجزہ رونما ہوگا اور انھیں بھٹو واپس مل جائے گا۔ واقعی بھٹو انھیں مل گیا لیکن 4/اپریل 1979ء کو اسے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے لاڑکانہ لایا گیا تو وہ جیل کی سلاخوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی آزمائشوں سے بھی آزاد ہو چکا تھا۔ سندھ میں بھٹو کے آبائی گاؤں میں ان کی لاش کے اردگرد خاندان کی عورتیں بین کر رہی تھیں۔ ہر آنکھ پرنم تھی، ہر دل اکشبار تھا اور ہر روح بے چین تھی لیکن 4/اپریل 1979ء کی صبح آہ فغاں میں مصروف بھٹو خاندان کی عورتوں کو یہ قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اس قسم کے لمحات ان کی زندگی میں کئی بار آئیں گے اور بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد وہ سازش ختم نہیں ہوگی جس کا شکار ملک کے سابق وزیراعظم ہوتے تھے بلکہ ایک ایک کر کے گڑھی خدا بخش میں مزید لاشیں آئیں گی۔ جن میں مرتضیٰ اور شاہ نواز کی لاشیں بھی ہوں گی جو غیر طبعی موت کا شکار ہوئے اور ملک کے سب سے بڑے سیاسی خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔

www.bhutto.org

الذوالفقار کا قیام اور ضیاء الحق کے منصوبے

ذالفقار علی بھٹو مرحوم کو 4/اپریل 1979ء کو سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے تختہ دار پر چڑھایا گیا۔ اس افسوسناک خبر کے بارے میں کئی افسانے مشہور ہوئے جن کا لب لباب یہ تھا کہ بھٹو کو پھانسی سے پہلے قتل کر دیا گیا تھا۔ ان افواہوں اور من گھڑت قصوں کے پیچھے ان افراد کا ہاتھ تھا جو ضیاء الحق کی بعض پالیسیوں کی وجہ سے ترقی سے محروم رہ گئے تھے۔ حالاں کہ بھٹو مرحوم نے پھانسی سے پہلے باقاعدہ شیو بنائی تھی اور وہ رات گئے تک اپنی آخری وصیت لکھنے میں مصروف رہے جسے بعض مصلحتوں کے باعث انھوں نے بعد ازاں ضائع کر دیا۔ دراصل وہ اپنی آخری وصیت کسی ایسے شخص کے حوالے نہیں کرنا چاہتے تھے جو جیل میں تعینات تھا۔ اپنے خاندان کے افراد سے متعلق وہ جو کچھ کہنا یا کرنا چاہتے تھے وہ کر چکے تھے۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کو مرحوم نے اپنے دونوں صاحبزادوں کے بارے میں بعض خصوصی ہدایات جاری کی تھیں۔ بھٹو نہیں چاہتے تھے کہ ان کا کوئی بھی بیٹا ضیاء الحق کی زندگی میں واپس آئے۔ وقت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی لاش جب ان کے آبائی گاؤں پہنچی تو ان کی اولاد یا بیگم میں سے کوئی بھی آخری دیدار نہ کر سکیں۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کو نظر بند کیا گیا تھا جب کہ مرتضیٰ اور شاہ نواز ملک سے باہر جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سابق وزیراعظم کو پھانسی دینے کے بعد ملک بھر میں مظاہرے ہوئے لیکن لیڈر شپ کے فقدان کے باعث ان مظاہروں میں شدت نہ آ سکی۔ بھٹو خاندان کے سربراہ میر نبی بخش بھٹو اس قابل نہ تھے کہ وہ سیاسی ذمہ داریاں نبھا سکتے۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ دنیا بھر سے آنے والے تعزیتی پیغامات وصول کرتے رہے۔ بھٹو کی پھانسی پر رنج و غم کا اظہار کرنے والوں میں نواب زادہ نصر اللہ خاں بھی شامل تھے جنھوں نے قومی اتحاد کی

www.bhutto.org

تحریک کے دوران مظاہروں کی قیادت کی۔ بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر کو 6/اپریل 1979ء کی صبح ایک خصوصی طیارے کے ذریعے رتو ڈیرو، لاڑکانہ جانے کی اجازت دی گئی جہاں انھوں نے بھٹو کی قبر پر فاتحہ پڑھی اور انھیں اسی شام واپس راولپنڈی پہنچا دیا گیا۔ اپریل اور مئی 1979ء کا مہینہ ہنگاموں، توڑ پھوڑ اور مظاہروں کے دوران گزرا۔ پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو جہاں موقع ملتا وہ فوجی حکومت کے خلاف مظاہرے کرتے۔ 28 مئی 1979ء کو بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو کو رہا کیا گیا اور وہ راولپنڈی سے کراچی پہنچیں، جہاں 70 کلفٹن پر عوام کی بڑی تعداد نے دھاڑیں مار مار کر ان سے تعزیت کی۔ بیگم نصرت بھٹو نے 8/اگست 1979ء کو اپنی عدت پوری ہونے کے بعد پارٹی کارکنوں کو بتایا کہ ان کے شوہر کو پھانسی سے قبل قتل کر دیا گیا تھا کیوں کہ ان کی گردن نہیں ٹوٹی تھی اور ان کا چہرہ معمول کی طرح تروتازہ تھا۔ بیگم نصرت بھٹو کے اس الزام کے باعث ایک دفعہ پھر ملک بھر میں بے چینی پھیل گئی اور جتنے منہ اتنی باتوں کے مصداق قصے کہانیاں گردش کرنے لگیں۔ بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر نے پارٹی کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لی اور انھوں نے پارٹی کارکنوں کو تلقین کی کہ وہ نئے انتخابات میں حصہ لینے اور کامیابی حاصل کرنے کے لیے تیاریاں مکمل رکھیں کیوں کہ ''ہم انتخابات میں حصہ لیں گے خواہ یہ انتخابات فوجی حکومت ہی کیوں نہ کرائے۔'' پیپلز پارٹی میں ان ایام میں ایک گروپ ایسا بھی ابھرا جس نے بیگم نصرت بھٹو کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ عام انتخابات کا بائیکاٹ کر دیں۔ تاہم بیگم نصرت بھٹو نے اس قسم کی باتوں پر توجہ نہ دی۔ پیپلز پارٹی کو انتخابات کا بائیکاٹ کرانے والوں کی ڈور آرمی ہاؤس کے ساتھ منسلک تھی اس لیے حکومت نے 30 اگست 1979ء کو انتخابات میں حصہ لینے کے لیے رجسٹریشن کی پابندی عاید کر دی جسے پی پی پی نے 13 ستمبر 1979ء کو مسترد کر دیا۔ اس کے بعد 19 ستمبر 1979ء کو ایک صدارتی آرڈی نینس جاری کیا گیا جس کے تحت ایسی جماعت کے ارکان، جس نے رجسٹریشن نہ کروائی ہو یا جس کی رجسٹریشن منسوخ کر دی گئی ہو، کو پارلیمنٹ یا صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے سے نااہل قرار دے دیا گیا۔ یہ تمام اقدامات دراصل پی پی پی کو انتخابی عمل سے دور رکھنے کے لیے کیے جا رہے تھے کیوں کہ انٹیلی جینس ایجنسیاں اپنی جائزہ رپورٹوں میں ضیاء الحق کو مطلع کر چکی تھیں کہ 17 نومبر 1979ء کو انتخابات ہونے کی صورت میں ملک میں ایک مرتبہ پھر پی پی پی کی حکومت کے بننے کا امکان موجود ہے کیوں کہ بھٹو کو پھانسی دیے جانے

www.bhutto.org

کے باعث پی پی پی کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے جب کہ مذہبی جماعتیں انتشار کا شکار ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کو خوب اچھی طرح اندازہ تھا کہ ان کے مہروں کی بدولت پی پی پی رجسٹریشن نہیں کروائے گی اور بھٹو صاحب کی اہلیہ اور بیٹی اس سازش کو نہ سمجھ سکیں گی جو انتخابات کو زیر التوا رکھنے کے لیے تیار کی گئی تھی۔ نتیجتاً رجسٹریشن نہ کروانے پر پی پی پی کے امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیے گئے۔ اس سے بھٹو خاندان کی عورتیں الیکشن میں حصہ لینے سے محروم ہوگئیں کیوں کہ ضیاء الحق نے 16 اکتوبر 1979ء کو عام انتخابات غیر معینہ عرصے کے لیے ملتوی کر دیے اور سیاسی رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ملک بھر میں فوجی عدالتیں قائم کر دی گئیں اور عوام کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ مارشل لاء کسے کہتے ہیں۔ پی پی پی کے کارکنوں کی پکڑ دھکڑ نے نوجوانوں میں بے چینی پیدا کر دی کیوں کہ جس کسی پر پی پی پی کے ساتھ وابستگی کا الزام ہوتا اسے فوجی عدالت میں پیش کر کے قید و بند، جرمانے اور کوڑوں کی سزائیں دلوائی جاتیں۔ یہ سلسلہ جب چل نکلا تو بھٹو خاندان سے پاگل پن کی حد تک محبت کرنے والے نوجوانوں کے پاس سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہ رہا کہ وہ ملک چھوڑ کر فرار ہو جائیں کیوں کہ 27 مئی 1980ء کو ضیاء الحق نے ہائی کورٹ کے اختیارات محدود کر دیے کیوں کہ بعض کیسوں میں ہائی کورٹ نے فوجی عدالتوں کی طرف سے دی جانے والی سزاؤں کو ختم کر دیا تھا۔ ضیاء الحق کے ان اقدامات کے باعث بھٹو خاندان کے مخالفین بھی چیخ اٹھے اور آہستہ آہستہ قومی اتحاد میں شامل جماعتوں اور پی پی پی کے درمیان صلح کے امکانات بڑھنا شروع ہوگئے۔ 1980ء کے دوران محترمہ بے نظیر بھٹو اور قومی اتحاد میں شامل جماعتوں کے درمیان بالواسطہ رابطہ برقرار رہا جب کہ مرتضیٰ اور شاہ نواز نے فوجی عدالتوں کے شکنجے سے بچ جانے والے کارکنوں کو افغانستان، شام اور دیگر ممالک میں گوریلہ تربیت دینے کا سلسلہ تیز کر دیا۔ اس دوران ضیاء الحق کے خلاف 2 مرتبہ ناکام بغاوتیں ہوئیں اور درجنوں جونیئر افسوں کو کورٹ مارشل کر کے سزائیں دی گئیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو اور بیگم نصرت بھٹو کے قومی اتحاد میں شامل جماعتوں کے ساتھ روابط کا نتیجہ یہ نکلا کہ 6 فروری 1981ء کو جمہوریت پسند جماعتوں نے ماضی کے اختلافات بھلا کر ایم آر ڈی قائم کر لی جس کا مقصد جمہوریت بحال کروانا تھا۔ جنرل محمد ضیاء الحق کو 1980ء میں ہی مصدقہ اطلاعات ملنا شروع ہوگئی تھیں کہ شاہ نواز بھٹو اور مرتضیٰ بھٹو نے ان کے قتل کی سازش تیار کی ہے اور ان کا زیادہ تر ان طالب علموں اور دانشوروں کے ساتھ رابطہ ہے جو 1977ء کے

www.bhutto.org

بعد لندن یا امریکا چلے گئے تھے۔ ان میں وہ افراد بھی شامل تھے جو مختلف مقدمات میں مارشل لاء حکام کو مطلوب تھے۔ اس لیے ہنگامی بنیادوں پر آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جینس نے بعض ایسے کارکنوں کی خدمات حاصل کیں جن پر قتل و غارت گری کے الزام میں مقدمات چل رہے تھے اس کے علاوہ انٹیلی جینس ایجنسیوں کے تربیت یافتہ عملے کو لندن، شام، بھارت اور فلسطین بھیجا گیا جہاں انھوں نے کسی نہ کسی طرح مرتضیٰ اور شاہ نواز تک رسائی حاصل کر کے الذوالفقار میں نمولیت اختیار کی۔ اس طرح ضیاء الحق الذوالفقار میں نقب لگانے میں کامیاب ہو گئے اور الذوالفقار آرگنائزیشن کے خفیہ منصوبے ڈبل ایجنٹوں کی موجودگی کے باعث آرمی ہاؤس پہنچنا شروع ہو گئے۔ میر مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز کو اچھی طرح علم تھا کہ ضیاء الحق نے اپنے بعض ایجنٹ ان کی صف میں شامل کر دیے ہیں کیوں کہ 80-1979ء کے دوران شاہ نواز نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں ادارہ قائم کر لیا تھا جو الذوالفقار میں شامل افراد پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ میر مرتضیٰ بھٹو نے کئی ایسے جعلی منصوبے بھی تیار کیے جن پر عمل درآمد کرنا مقصود ہی نہ تھا مگر وہ منصوبے ٹاپ سیکرٹ فائلوں کی زینت بن کر ضیاء الحق تک پہنچتے رہے۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کی یہ عادت تھی کہ وہ انٹر سروسز انٹیلی جینس (آئی ایس آئی) اور ملٹری انٹیلی جینس کی مرتضیٰ اور شاہ نواز کی سرگرمیوں کے بارے میں تیار کردہ رپورٹس کو جرنیلوں کے سامنے رکھا کرتے تھے۔ ضیاء الحق کے پاس ایسی درجنوں رپورٹس موجود تھیں جو مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز کی گفتگو پر مبنی تھیں اور ان رپورٹس میں ذوالفقار علی بھٹو کے صاحبزادے یہ عزم کرتے نظر آتے تھے کہ ان کے تربیت یافتہ کمانڈوز جلد پاکستان میں داخل ہو کر فوجی قیادت کو قتل کرنے والے ہیں۔ مارشل لاء کے زمانے میں تین اسلامی ممالک مصر، شام اور لیبیا میں موجود پاکستانی سفارتخانوں میں خصوصی طور پر حساس اداروں کے اہلکار ان عہدوں پر تعینات کیے گئے تھے جو عہدے وزارت خارجہ سے تعلق رکھنے والے افسران کے لیے مخصوص تھے۔ یہ پاکستانی سفارتکار مرتضیٰ اور شاہ نواز کی سرگرمیوں پر خصوصی نظر رکھتے تھے اور کوئی دن ایسا نہیں ہوتا تھا جب ضیاء الحق کو بھٹو مرحوم کے صاحبزادوں کی سرگرمیوں کے بارے میں رپورٹ نہ ملتی۔ انہی ایام میں کراچی یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے درجنوں طالب علموں کو افغانستان میں تربیت دی جا رہی تھی اور مرتضیٰ کا ایسے طالب علموں سے ہر وقت رابطہ رہتا تھا۔ بیگم نصرت بھٹو کی حکمت عملی یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح تمام سیاسی جماعتوں کو

www.bhutto.org

بحالی جمہوریت کے لیے چلائی جانے والی تحریک میں شامل کر لیا جائے جب کہ اس کے ساتھ ساتھ اس چیز کی بھی کوششیں کی گئیں کہ ضیاء الحق امن عامہ کی صورت حالات کنٹرول کرنے میں ناکام ہو جائیں۔ بھٹو خاندان کے نزدیک ضیاء الحق ذوالفقار علی بھٹو کے قاتل تھے اور مرتضٰی نے اس بات کا عزم کر رکھا تھا کہ وہ اپنے والد کے قاتل کو معاف نہیں کرے گا۔ فروری 1981ء میں صورت حالات یہ تھی کہ وہ سیاسی جماعتیں اور مذہبی رہنما جو 1977ء میں بھٹو کو اقتدار سے محروم کرنے کے لیے فوجی قیادت کا ساتھ دے چکے تھے، انتخابات کے انعقاد کو یقینی بنانے کے لیے ضیاء الحق کے خلاف صف بندی کرنے پر تیار تھے اور غالب امکان یہی تھا کہ مارچ 1981ء میں ملک بھر میں احتجاجی تحریک شروع کر دی جائے گی لیکن ابھی ایم آر ڈی اپنے منصوبوں کو عملی شکل دے ہی پائی تھی کہ 2 مارچ 1981ء کو سلام اللہ ٹیپو اور ان کے ساتھیوں نے پی آئی اے کا طیارہ اغوا کر کے کابل پہنچا دیا۔ اس طیارے میں 148 مسافر سوار تھے جب کہ ہائی جیکروں نے ابتدا میں 29 مسافروں کو رہا کر دیا جن میں عورتیں اور بچے شامل تھے۔ بدقسمتی سے طیارے میں طارق رحیم بھی موجود تھے جو 5 جولائی 1977ء کی شام وزیر اعظم ہاؤس میں موجود تھے جب مارشل لاء لگایا گیا۔ مرتضٰی بھٹو کے ساتھیوں نے میجر طارق رحیم کو گولی مار کر قتل کر دیا۔ پی آئی اے کے طیارے کے اغوا سے متعلق انٹر سروسز انٹیلی جینس کی رپورٹ یہ تھی کہ ہائی جیکروں نے یہ کارنامہ ایک بین الاقوامی دہشت گرد کارلوس کے تعاون سے انجام دیا۔ یہ کارلوس وہی شخص تھا جس نے IOEC کے تیل کے وزراء کو 1976ء میں یرغمال بنایا تھا۔ ہائی جیکروں کی کارلوس سے یہ ملاقات لیبیا میں کروائی گئی اور جس روز پی آئی اے کے طیارے کو اغوا کیا گیا اس دن کارلوس کا مرتضٰی بھٹو کے ساتھ رابطہ قائم تھا۔ اس وقت کے سیکریٹری دفاع جنرل رحیم الدین نے 2 مارچ 1981ء کی رات ہی ضیاء الحق کو انتہائی وثوق سے بتا دیا تھا کہ پی آئی اے کا طیارہ اغوا کرانے والوں میں بین الاقوامی دہشت گرد کارلوس اور الذوالفقار ملوث ہے۔ مرتضٰی بھٹو کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ان کی تنظیم سے وابستہ چند نوجوان کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے والے ہیں۔ پی آئی اے کے طیارے کی ہائی جیکنگ کا معاملہ ایم آر ڈی کی تحریک کو کچلنے میں بہت مدد و معاون ثابت ہوا کیوں کہ سکیورٹی حکام نے ہائی جیکنگ کے واقعے کے بعد ملک بھر میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ضیاء الحق نے 7 مارچ 1981ء کو وفاقی کابینہ کے اجلاس میں کافی غور و خوض کے بعد یہ موقف اختیار کیا کہ حکومت

www.bhutto.org

پاکستان ہائی جیکروں کے سامنے قطعاً نہیں جھکے گی۔ سیکورٹی حکام کی تیار کردہ رپورٹس سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ ہائی جیکنگ کے واقعہ میں کابل انتظامیہ براہِ راست ملوث ہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق اس بات سے چوں کہ اچھی طرح آگاہ تھے کہ بعض اسلامی ممالک مرتضٰی اور شاہ نواز کو ہر قسم کی مدد فراہم کر رہے ہیں اس لیے انھوں نے عراق، انڈونیشیا، لیبیا، فلسطین، شام اور بنگلہ دیش کے حکام سے کہا کہ وہ کابل میں موجود اپنے سفارتی عملے کے ذریعے ہائی جیکروں کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ یرغمال مسافروں کو رہا کر دیں۔ تاہم حکومت پاکستان کو اس وقت انتہائی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب کابل انتظامیہ نے اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری کرٹ والڈ ہائم کے توسط سے اسلام آباد انتظامیہ کو پیغام دیا کہ وہ ہائی جیکروں کے مطالبات جس قدر جلدی ممکن ہو سکے تسلیم کر لے وگرنہ افغانستان کی حکومت ان نتائج کی ذمہ دار نہیں ہوگی جو آنے والے دنوں میں رونما ہو سکتے ہیں۔ ضیاء الحق جیسے مضبوط جرنیل کے لیے یہ بات انتہائی شرم کا باعث تھی کہ اس قدر مضبوط فوج اور آئی ایس آئی جیسے ادارے کے ہوتے ہوئے وہ ہائی جیکروں کے سامنے جھک جائیں۔ حکومت نے اس کا حل یہ نکالا کہ افغانستان میں متعین پاکستانی سفیر کے ذریعے کابل انتظامیہ کو پیغام دیا کہ وہ ہائی جیکروں پر قابو پانے کے لیے پاکستانی کمانڈوز کو اپریشن کرنے کی اجازت دے دیں۔ تاہم افغانستان نے پاکستانی کمانڈوز کو اس قسم کی اجازت دینے سے انکار کر دیا حالاں کہ پاک فوج کے کمانڈوز نے طیارے کو ہائی جیکر کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے ہر قسم کی منصوبہ بندی اور ریہرسل مکمل کر رکھی تھی۔ اگر افغان حکومت کا طیارے کے اغوا میں کوئی ہاتھ نہ ہوتا تو پاکستانی کمانڈوز طیارہ ہائی جیک ہونے کے 48 گھنٹے کے اندر ہی مسافروں کو رہا کروا لیتے۔ افغانستان میں اس وقت وزیر خارجہ کے ایک آفیسر فصیح الدین کے ساتھ میر مرتضٰی بھٹو کے خصوصی مراسم تھے۔ فصیح الدین احمد کی دو لڑکیوں کی بعد ازاں شاہ نواز اور مرتضٰی کے ساتھ شادی ہوئی۔ شاہ نواز کی بیوی کا نام ریحانہ اور مرتضٰی کی افغان بیوی کا نام فوزیہ تھا۔ ہائی جیکنگ کے ڈرامے کے بعد پاکستانی وزیر خارجہ آغا شاہی اور شاہ محمد دوت کے درمیان ہونے والے مذاکرات کی تفصیلات مرتضٰی بھٹو تک پہنچتی رہیں۔ ہائی جیکنگ کے اس واقعے کے بد بے نظیر بھٹو کو اچھی طرح علم تھا کہ فوجی حکام انھیں معاف نہیں کریں گے۔ اس لیے وہ 70 کلفٹن کراچی سے قومی اسمبلی کی ڈپٹی سپیکر بیگم اشرف عباسی کے گھر چلی گئیں جہاں سے انھیں 8 مارچ 1981ء کو گرفتار کیا گیا جب کہ بیگم نصرت بھٹو کو جیل بھجوا دیا گیا۔ ہائی جیکروں

www.bhutto.org

نے پاکستان کو 92 سیاسی قیدی رہا کرنے کے لیے ایک فہرست فراہم کی تھی۔ ان 92 افراد میں ایسے بھی نوجوان شامل تھے جنھیں پولیس نے بے گناہ پکڑ رکھا تھا۔ جب انھیں پتا چلا کہ ہائی جیکروں نے یرغمالی مسافروں کی رہائی کے بدلے ان کو جیلوں سے آزاد کرنے کا مطالبہ کیا تو انھوں نے رہائی حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں سے بعض سیاسی قیدیوں نے حکومت کو کہا کہ وہ انھیں گولی مار دیں، مگر انھیں ہائی جیکروں کے کہنے پر رہا نہ کریں کیوں کہ ان کا مرتضٰی بھٹو کی تنظیم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھیں مرتضٰی بھٹو کے گروپ کا رکن بنا کر حکومت نے بلیک لسٹ کر دیا اور ان کے اہل خانہ پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ ہائی جیکروں نے ضیاء الحق کو جن 92 افراد کی فہرست فراہم کی تھی ان میں 15 وہ افراد بھی تھے جو ہائی جیکروں کے رشتے دار تھے، لیکن ہائی جیکروں نے کہا کہ وہ 92 سیاسی قیدیوں کی رہائی تک پی آئی اے کے مسافر رہا نہیں کریں گے۔ پی آئی اے کے جس طیارے کو اغوا کیا گیا تھا اس میں قبائلی علاقہ جات سے تعلق رکھنے والے بعض مسافر بھی شامل تھے۔ اس وقت جب کہ حکومت ہائی جیکروں کے ساتھ مذاکرات میں مصروف تھی، قبائلی علاقہ جات سے تعلق رکھنے والے زعماء نے پھڈا ڈال دیا کہ ہائی جیکروں کے رشتہ داروں کو ان کے حوالے کیا جائے کیوں کہ جب تک ہائی جیکر ان کے عزیزوں کو رہا نہیں کریں گے وہ ہائی جیکروں کے رشتے داروں کو یرغمال بنا کر رکھیں گے۔ ضیاء الحق کے لیے یہ مسئلہ ایک نئی مصیبت سے کم نہ تھا کیوں کہ پٹھانوں نے دوٹوک الفاظ میں حکومت کو کہا کہ اگر ان کے عزیزوں کو یرغمال بنانے والے ہائی جیکروں کی شرائط تسلیم کر لی گئیں اور اس کے باوجود ان کے عزیزوں کو نقصان پہنچ گیا تو وہ ضیاء الحق کو نہیں چھوڑیں گے۔ اس وقت جب کہ پی آئی اے کے طیارے میں سوا سو سے زائد مسافروں کی زندگی خطرے میں تھی فوجی حکام نے کراچی جیل میں بیگم نصرت بھٹو سے درخواست کی کہ وہ اپنے صاحبزادے مرتضٰی سے بات کریں تاکہ اغوا شدہ جہاز کے مسافروں کو رہا کروایا جا سکے، لیکن بیگم نصرت بھٹو نے فوجی افسران کو ڈانٹ دیا کیوں کہ ان کو یقین تھا کہ ہائی جیکنگ کا ڈرامہ ضیاء الحق کا اپنا تیار کردہ ہے جس کا مقصد ایم آر ڈی کی تحریک کو کچلنا ہے۔ ''میرے بیٹے مرتضٰی یا شاہ نواز کا ہائی جیکنگ کے ڈرامے سے کوئی تعلق نہیں۔'' بیگم نصرت بھٹو نے 7 مارچ 1981ء کو فوجی حکام پر واضح کیا جس کے بعد ہائی جیکروں نے حکومت پاکستان سے مزید مذاکرات کرنے سے انکار کر دیا اور وہ طیارہ لے کر 8 مارچ 1981ء کو دمشق پہنچ گئے۔ شام کے دارالحکومت

www.bhutto.org

دمشق میں ہائی جیکروں اور ضیاء الحق کی نامزد کردہ مذاکراتی ٹیم کے درمیان 9 مارچ 1981ء کو مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ شام کے صدر حافظ الاسد اور ضیاء الحق کے درمیان متعدد مرتبہ ٹیلی فون پر رابطہ قائم ہوا۔ حافظ الاسد کے ذوالفقار علی مرحوم کے ساتھ انتہائی دوستانہ تعلقات تھے اور مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جب مرتضیٰ اور شاہ نواز دمشق پہنچے تو حافظ الاسد نے انھیں ہر قسم کی امداد فراہم کی اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ افغان حکومت کے سربراہ ببرک کارمل کا اگرچہ بھٹو کے ساتھ کوئی زیادہ تعلق نہ تھا لیکن مرتضیٰ بھٹو کی مدد وہ محض اس لیے کر رہے تھے کہ پاکستانی حکام نے اسلام پسند تنظیموں خصوصاً گلبدین حکمت یار کو اسلحہ اور دیگر ساز و سامان فراہم کیا تھا جس کے باعث انھوں نے شمالی افغانستان میں افغانستان کی حکومت کو سخت نقصان پہنچایا۔ ہائی جیکر جب پی آئی اے کا طیارہ اغوا کر کے کابل پہنچے تو اس وقت ان کے پاس محدود اسلحہ تھا جب کہ 8 مارچ 1981ء کی شب وہ کابل سے دمشق روانہ ہوئے تو ان کے پاس جدید ترین اسلحہ موجود تھا جس کے بارے میں ضیاء الحق نے حافظ الاسد کو بتایا کہ سلام اللہ ٹیپو اور عبدالناصر خاں ہائی جیکروں کو یہ اسلحہ افغان حکومت نے فراہم کیا۔ مرتضیٰ بھٹو جن کی عمر اس وقت 26 سال تھی 1980ء کے اواخر میں کابل شفٹ ہو گئے تھے جہاں ان کے منتخب کردہ ساتھیوں کو گوریلہ تربیت دی جاتی تھی۔ مرتضیٰ بھٹو کے بارے میں آئی ایس آئی کی رپورٹ یہ تھی کہ طیارہ اغوا ہونے سے قبل وہ کابل میں موجود تھے جب کہ مرتضیٰ نے ان الزامات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی اختیار کی تھی جس سے لگتا تھا کہ وہ افغانستان میں موجود ہیں وگرنہ وہ لندن یا فرانس میں ہوتے تو اپنے اوپر لگائے جانے والے الزامات کی تردید کر سکتے تھے۔ بہر حال حافظ الاسد اور ضیاء الحق کے درمیان براہ راست ہونے والے مذاکرات کے نتیجے میں 14 مارچ 1981ء کو ہائی جیکنگ ڈراما ختم ہو گیا اور حکومت نے ہائی جیکروں کے کہنے پر 54 سیاسی قیدی رہا کرنے کے بعد مسافروں کو آزاد کروالیا۔

www.bhutto.org

بے نظیر کا خطاب اور جمہوری تقاضے

کچھ عرصہ قبل محترمہ بے نظیر بھٹو امریکا میں بوسٹن کی ہارورڈ یونیورسٹی اور دوسرے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں خطاب کر رہی تھیں۔ بوسٹن کے امریکی پاکستانی حلقوں میں بھی ان کی اپنے شوہر آصف زرداری کے ساتھ سیاسی اختلافات کی خبریں عام تھیں۔

آصف زرداری کے بہت ہی قریبی حلقوں نے بھی تسلیم کیا کہ میاں بیوی علیحدہ علیحدہ بولیاں بول رہے ہیں۔ عام تاثر یہ ہے کہ آصف زرداری فوج کے ساتھ فوری مفاہمت چاہتے ہیں جب کہ محترمہ اے آر ڈی کے ساتھ مل کر طویل جدوجہد کے حق میں ہیں۔ وہ اور نواز شریف جمہوریت کو اس طرح بحال کرنے کے حق میں ہیں کہ فوج پھر کبھی سیاست میں نہ آسکے۔ بہر حال اس بات کا احساس بہت کم لوگوں میں پایا گیا کہ نام نہاد اختلافات کے باوجود میاں بیوی ایک بنیادی بات پر متفق ہیں کہ الیکشنوں کا انعقاد جمہوری معاشرے کے قیام کی ضمانت نہیں ہے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو نے ہارورڈ یونیورسٹی لاء کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ضروری نہیں کہ الیکشنوں سے جمہوریت بھی قائم ہو جائے۔ ایک سوال کا جواب میں انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ الیکشن صرف نقطہ آغاز ہو سکتے ہیں لیکن جمہوری معاشرے کے قیام اور بقاء کے لیے عدلیہ، انتظامیہ اور دوسرے بہت سے اداروں کی اصلاح کی شدید ضرورت ہے اور مذہبی نظام کے تحت جمہوری معاشرے کا قیام ممکن نہیں۔

اسی طرح اگر مذہبی نظام کا نفاذ غیر جمہوری معاشرہ قائم کرنے کے مترادف ہے (جیسا کہ آصف زرداری کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے) تو پاکستان کے آئین کو غیر مذہبی جماعتوں نے ہی مذہبی بنایا۔ پاکستان کی پوری تاریخ میں تحریک مقاصد سے لے کر احمدیوں

www.bhutto.org

کو اقلیت قرار دینے تک نام نہاد غیر پارٹیاں اور شخصیات ہی مذہبی ایجنڈے کے نفاذ کے لیے استعمال ہوئیں۔

یحییٰ خان لاکھ ''بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے فارمولے کے تحت زندگی گزار رہے ہوں لیکن مذہبی نظام کے نفاذ کے سلسلے میں ان کی خدمات ایسی ہیں کہ جماعت اسلامی کے مولانا طفیل احمد تک نے ان کی حمایت کی۔ ذوالفقار علی بھٹو عوامی جلسے میں یہ کہہ کر بھی کہ ''تھوڑی سی پی لیتا ہوں'' نفاذ شریعت کا فریضہ نبھانے کی پوری کوشش کرتے رہے۔

ماضی میں مذہبی جماعتوں نے اپنا ایجنڈا دوسری پارٹیوں کے ذریعے سے نافذ کروایا۔ اب وہ خود میدان میں آ کر اس سلسلے کو آگے بڑھانا چاہتی ہیں تو لگتا ہے کہ پاکستان مذہبی ڈکٹیٹرشپ کا شکار ہوتا جارہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان پہلے ہی اس کا شکار ہو چکا ہے۔ اس امر کا احساس اس لیے مقصود ہے کہ زیادہ عرصہ فوج اقتدار پر قابض رہتی ہے اور اصلی اور نقلی جمہوریت کی تمیز ہو نہیں پاتی۔ سب پارٹیاں الیکشن کا مطالبہ کرتی ہیں تو تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ جمہوریت بھی نافذ کرنا چاہتی ہیں لیکن عملاً ایسا نہیں۔ محترمہ بے نظیر کا یہ کہنا تو درست ہے کہ محض الیکشنوں سے جمہوریت قائم نہیں ہو سکتی لیکن ان کے پاس کوئی ٹھوس پروگرام بھی نظر نہیں آتا جس سے حقیقی جمہوریت قائم ہو سکتی ہو۔

www.bhutto.org

پانچ جولائی محض ایک تاریخ نہیں

پانچ جولائی۔ یہ صرف دیوار پر لگے کیلنڈر پر جولائی کے مہینے کی ایک تاریخ ہی نہیں۔ یہ کچھ کے لیے نسیم صبح بہار تھی تو کچھ کے لیے ایک بھونچال تھا۔ جیسے ایک شاعر حسن درس نے لکھا ہے کوئی کوئی دور آدمی کے حلق میں پھرتی تلواروں جیسا ہوتا ہے۔ یہ دور مور کے پاؤں تھا یا چور کے پاؤں۔ میں نے اس کے پیروں کے نشانات وہاں سے اٹھائے ہیں جہاں سے یہ دور شروع ہوا تھا۔ یعنی پنڈی (راولپنڈی) سے۔

ایک ایسا دن جس پر مٹھائیاں بھی بٹیں تو چولھے بھی بجے تھے۔ کسی کے لیے جیلوں کے دروازے کھلے تو کسی کے لیے بند ہوئے تھے۔ بالکل اسی گانے کی طرح ''آج کسی کی ہار ہوئی ہے اور کسی کی جیت''۔ یہ پاکستان میں ضیاء الحق اور ان کے مارشل کی آمد کا دن تھا۔ ''سب ٹرپل ون بریگیڈ یا گیارہ کور کا کرشمہ ہے''، مجھے کوئی کہہ رہا تھا۔

ریڈیو، ٹی وی سٹیشنوں، وزیر اعظم ہاؤس اور پارلیمان ہاؤس پر قبضہ اور پھر یہ آواز: ''میرے عزیز ہم وطنو! اسلام وعلیکم''، جیلوں کے پھاٹک وا ہو گئے تھے، ہتھکڑیاں گنگنانے لگی تھیں اور پھانسی کی رسیوں پر لکھن ملا جا رہا تھا۔

پاکستان میں ہر آدمی اور ہر گھر کے پاس اس دورِ پر آشوب کے متعلق ایک ذاتی یادداشت اور ایک ذاتی قصہ کہانی ضرور ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ایک پوری نسل اپنی کمر پر کوڑے کھانے کے لیے ''میڈیکل فٹ'' قرار دے دی گئی تھی۔

ننگی پشت سے بھی نیچے کی ادھڑتی کھال اور گوشت سے بہتے ہوئے خون والا کوئی سیاسی قیدی جلاد کو گالیاں دے کر کہتا تھا۔ مارو!

''لڈی ہے جمالو پاؤ لڈی ہے جمالو'' اسی دور کی فلم ''صاحب جی'' کا گانا تھا۔

www.bhutto.org

اس نسل نے اپنے آپ کو ''لڈی ہے جمالو'' میں گم کر دیا تھا اور پھر ایسی راہ پر لے پڑے تھے جو تلوار سے تیز اور بال سے بھی نرم تھی۔

شاید ایسے سفر کو ہی ''جو راہ ادھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے'' کہا گیا تھا۔ کہنے والوں کی زبان میں یہ ''سرے والی سرکار'' کا دور شروع ہوا تھا۔ یہ ضیاء الحق تھے۔ ''تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو''۔

ویسے میرا خیال ہے کہ برصغیر نے اورنگزیب اور رنجیت سنگھ کے بعد ہی ایسا حاکم دیکھا ہوگا اگر وہ حضرات بھی 1977ء میں ہوتے تو چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کہلاتے۔

''ظل سبحانی'' جنرل محمد ضیاء الحق کا یہ دور وہ ''کمبل'' ہے جس کو پاکستان تو چھوڑ چکا لیکن وہ آج تک پاکستان کو نہیں چھوڑتا۔ ''مارشل لا بھنگ''، ان دنوں پنجاب سے بھونے ہوئے پتوں والی بھنگ کو کہا جاتا تھا۔ اس کا نشہ انقلاب کے نشے سے زیادہ زور آور تھا

مجھے نہیں معلوم کہ حیدر آباد سندھ میں پکے قلعے کے صدر دروازے پر لگا ہوا ضیاء الحق کا کٹ آؤٹ اب بھی موجود ہے یا نہیں لیکن وہاں ایک ''قیوم چریا'' نامی شخص ضیاء الحق کا زبردست مداح تھا جو سنہ انیس سو پچاسی کے غیر جماعتی انتخابات میں ایم پی اے بھی بنا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر جنرل ضیاء نے ملک سے مارشل لا اٹھا دیا تو وہ اسمبلی کی نشست سے استعفیٰ دے دے گا۔ لیکن ہنسی بھول جانے والے اس عہد میں ہنسنے کی جو چیزیں ہوتی تھیں وہ قیوم چریا کی تقریریں ہوا کرتی تھیں۔

نیا زسٹیڈیم میں کالے خان کو چینی کی بلیک مارکیٹنگ کے الزام میں سرعام کوڑے لگائے گئے جسے دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ آئے اور انھوں نے یہ مناظر بھی ویسے ہی دیکھے جیسے وہ وہاں کرکٹ کے میچ دیکھا کرتے تھے۔

سٹیڈیم میں ٹنگی ٹکٹکی پر اوندھے منہ شلوار گھٹنوں تک اتری ہوئی۔ کالے خان کے منہ کے آگے لاؤڈ سپیکر فٹ کیے گئے تھے اور جلاد جب اسے کوڑے مارتا تو کالے خان کی چیخیں کسی ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی رونگٹے کھڑے کرنے والی آواز کی طرح سارے سٹیڈیم میں پھیل جاتیں۔ لوگ ار پر ''نعرۂ تکبیر'' ''مرد مومن مرد حق، ضیاء الحق ضیاء الحق'' اور ''اسلام زندہ باد'' کے نعرے بلند کرتے۔

کہتے ہیں کہ کالے خان اور اس وقت کے مارشل لاء انتظامہ کے افسر کی رشوت

www.bhutto.org

کی رقم پر آپس میں نہیں بنی تھی۔ پرانگو لین کوٹری کے میخانے میں چرس کی چلم پیتے ہوئے ''فقرا'' کہتے کہ ''تھانیدار غلام علی خان نے کیس کے کاغذات ہی ایسے تیار کیے کہ بس۔

کالے خان تو کیا صحافیوں سے لے کر نابینا عورت تک سب کو کوڑے لگائے گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ پورے ملک کو ''تو کہ ناواقف آداب غلامی ہے ابھی'' اور کوڑوں کی تھاپ پر رقص سکھایا جارہا تھا۔

بس شیما کرمانی ایک ایسی عورت تھی جس نے سچ مچ میں رقص کی جرأت کر لی تھی وہ کارٹونسٹ فیکا تھا جو ضیاء الحق کے کارٹون بنایا کرتا تھا۔ میں نے خود تو اس کے منہ سے نہیں سنا لیکن مجھے ایک دوست بتا رہا تھا کہ ضیاء الحق کے مرنے پر فیقا نے کہا ''میرے کارٹونوں کے لیے کیریکٹر مرگیا۔''

گلیاں تو پانچ جولائی انیس سو ستتر کی شب سے ہی سونی ہو چکی تھیں لیکن ان میں کوئی کوئی مرزا یار پھرنے کی ہمت کرتا تھ۔ پنڈی سے مری ہری پور روڈ تو اس سے بھی پہلے بند ہو چکی تھی۔ کہتے ہیں چار جولائی کو اسلام آباد میں امریکی سفارتخانے میں امریکا کے یوم آزادی کے موقع پر دیے جانے والے استقبالیے میں چیف آف آرمی سٹاف ضیاء الحق موجود نہیں تھے۔ وزیراعظم بھٹو نے اپنے سٹاف سے پوچھا تو بتایا گیا کہ وہ کہیں مصروفیت کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکے۔

پنڈی لگی وینی آں میں پنڈی لگی وینی آں
میڈا کم سنیارے نال
ماہی گلاں کرے میں سنڑاں سہارے نال

پنڈی میں پیدا ہونے والا میرا دوست خاور مہدی اس پر کڑھتا ہے کہ بہت یس غیر واف لوگ پنڈی کو صرف جی ایچ کیو، جرنیلوں، کرنیلوں، ٹریل ون اور سازشوں کے حوالوں سے کیوں جانتے ہیں۔ وہ کہتا ہے راولپنڈی بڑے بڑے ''جگرے والے'' لوگوں اور محنت کشوں کا شہر ہے۔ ان دنوں میری نیڈ میں رہنے والے خاور سے میں نے پاکستان میں ضیاء الحق اور ان کے مارشل لاء پر اس کی اپنی یادداشتیں پوچھیں تو اس نے کہا: ''ایک عجیب قسم کا احساس زیاں تھا۔ ایک ایسا عہد جو میری عمر کے لڑکے لڑکیاں انتظار اور ملنے میں گزار رہے تھے اور جسے میں نے پولیس سے چھپتے گزار دیا۔ میں کپڑے پنڈی کی دیواروں

www.bhutto.org

پر مارشل لاء مخالف نعرے لکھتے سیاہی کے دھبوں اور رنگوں میں رنگے ہوتے تھے۔ لیکن مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ میں نے اپنا کام کیا۔''

اور پھر ملک میں اٹھنے والی حکومت مخالف تحریکوں کی شروعات کرنے والے اپنے ''گورڈن کالج'' کے دنوں میں گم ہوگیا۔ راجہ انور، ''چاچا'' صفدر ہمدانی (اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی)، شیخ عبدالرشید (موجودہ وزیر نہیں بلکہ اپنے دور کا ایک اور طالب علم رہنما جو جب جیل سے رہا ہوا تو اس کا بھٹو سے بھی بڑا استقبال ہوا تھا) خود موجودہ وزیر شیخ رشید احمد ضیاء الحق کے انہی دنوں میں لندن میں جلاوطن بے نظیر بھٹو کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک ہوئی تو دروازہ کھلنے پر وہاں پنڈی کی ایک لڑکی کھڑی تھی اور وہ تھی ناہید خان جس سے بے نظیر کی پہلے کوئی ملاقات نہیں تھی۔ یہ اپارٹمنٹ جہاں نیر حسین ڈار، جام صادق علی، وکٹور شفیلڈ، بشیر ریاض اور بھٹو برادران ہوا کرتے تھے۔ جریدہ اور پمفلیٹ نکالے جاتے تھے۔

مجھے اب کینیڈا میں رہنے والے اسلام آباد کے ایک سابق استاد بتا رہے تھے کہ کس طرح ضیاء الحق کے پاکستان میں انھوں نے غیر ملکیوں سے ہنگاموں میں لوٹی ہوئی ولایتی وہسکی کی بوتل جمعیت کے ایک پرجوش کارکن طالب علم سے پچاس روپے میں خریدی تھی۔

www.bhutto.org

فوج کے ذہن پر اب بھی بھٹو کا خوف؟

پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی موت کو ستائیس برس ہو چکے ہیں لیکن بظاہر ایسا دکھائی دیتا ہے کہ فوج کے ذہن میں اب بھی ان کا خوف موجود ہے۔

اس بات کا اندازہ اس وقت ہوا جب بھٹو مرحوم کی ستائیسویں برسی کے موقع پر راولپنڈی کی ضلعی جیل کی اس جگہ پہنچا جہاں انھیں پھانسی دی گئی تھی اور اب عوام کے لیے پارک بن چکا ہے۔ وہاں پہنچنے پر فوجی اہلکاروں نے تصویریں بنانے سے روک دیا اور کیمرہ چھین لیا۔

پارک کے احاطے سے باہر کار پارکنگ میں جب میں نے ''سٹینڈ اپ'' کرنا چاہا تو انھوں نے ریکارڈنگ کے آلات بھی چھینے اور کہا کہ اب تو کرنل صاحب کے پاس جانا ہوگا۔

ہوا یوں کہ صبح اطلاع ملی کہ پیپلز پارٹی کے تین درجن کے قریب کارکن، جن میں اکثریت خواتین کی تھی، حسب معمول راولپنڈی کی پرانی جیل کی جگہ جمع ہوں گے۔ جیل کے پھانسی گھاٹ کے مقام پر بے نظیر بھٹو کی حکومت میں یادگار کے طور پر تین بڑے سنگ مرمر کے مینار بنائے گئے تھے۔ جب پیپلز پارٹی کے کارکن قرآن خوانی اور اپنے لیڈر کے ایصال ثواب کے لیے دعا کرنے وہاں پہنچے تو بھاری تعداد میں پہلے سے تعینات پولیس اور فوج نے انھیں اندر جانے سے روک دیا۔

میں نے پیپلز پارٹی کے بنیادی رکن اور بھٹو کے قریبی ساتھی سردار سلیم سے رابطہ کیا اور ان سے ساتھ چلنے کی درخواست کی تاکہ وہ پھانسی گھاٹ اور اس کھولی کی نشاندہی کرسکیں جہاں بھٹو قید رہے تھے کیوں کہ اب وہاں نشانات مٹ چکے ہیں۔ وہ راضی ہوگئے

اور میں انھیں ساتھ لے کر پرانی جیل اور موجودہ پارک پہنچا۔ آس پاس پنجاب کے ''ایلیٹ فورس'' کے دستے نظر آئے جب کہ صدر دروازے پر فوجی اہلکار ملے۔ میں نے دس روپے کا کار پارکنگ ٹکٹ خرید کر جب پارک میں جانا چاہا تو فوجی اہلکاروں نے روک دیا۔

فوج کے ایک سپاہی نے کہا ''دیکھیں جی ہمیں اوپر سے حکم ہے کہ کسی کو بھی آج پارک کے اندر آنے نہ دیا جائے اور کسی صحافی کو تصویر یا فلم بنانے کی اجازت نہ دی جائے۔''

پارک کے ساتھ ہی واقع کرنل کے دفتر پہنچا تو ان کے سادہ کپڑوں میں ملبوس ملازم نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔ کچھ دیر بعد جب کرنل نہیں آئے تو ان سے میں نے کہا کہ اگر انھیں دیر ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ اس پر ملازم نے کہا کہ اب تو آپ کرنل سے ملے بنا واپس نہیں جاسکتے۔ میں نے کہا ایسا کیوں ہے تو انھوں نے کہا کہ دیکھیں فوج میں ''کیوں'' نہیں ہوتا اور اس سے جھگڑا شروع ہوتا ہے۔

خیر کچھ دیر بعد ٹی شرٹ پہنے کرنل آئے۔ انھیں ہم نے اپنے اوپر بیتی داستان سنائی تو کہنے لگے ''میرے لڑکے نے ٹھیک کیا، کسی کو بھی تصویر بنانے یا فلم بنانے کی اجازت نہیں ہے۔''

جب ان سے میں نے کہا کہ عوامی پارک کی تصویر بنانے پر پابندی کیوں ہے؟ تو انھوں نے کہا کہ یہ آرمی ایریا ہے کیوں کہ یہ پارک بنانے کا کام فوج کر رہی ہے۔ انھوں نے اپنے کپتان سے کہا کہ ان کا کیمرہ چیک کریں کہیں تصویر تو نہیں بنائی۔ کپتان نے کیمرہ لیا اور تصویریں چیک کیں اور کہا ''نہیں سر کوئی نہیں''۔

اجازت ملی تو کرنل نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: ''کیا رکھا ہے اس خبر میں ایک آدمی مر گیا، اب چھوڑیں'' میں نے ان سے کہا کہ ہاں خبر میں تو کچھ نہیں لیکن آپ نے پابندیاں لگا کر خبر بنوا دی۔

میں کرنل کے کمرے سے باہر نکلا تو اچانک خیال آیا کہ آخر کیا وجہ تھی ستائیس برس بعد بھی مرے ہوئے بھٹو کا خوف آج بھی ان فوجیوں کے سر پر سوار ہے۔

میرے ایک دوست گاڑی میں انتظار کر رہے تھے واپسی پر انھوں نے بھٹو کے بارے میں کافی معلومات ہونے کا دعویٰ کیا۔ انکا کہنا تھا کہ جب بھٹو کو مری میں قید رکھا گیا

www.bhutto.org

تھا اس وقت ضیاء الحق ان سے ملنے گئے تھے اور پیشکش کی تھی اگر فوج سے اقتدار اور اختیار ''شیئر'' کرو تو تمہیں وزیر اعظم بنا دیں گے۔

ان کے مطابق بھٹو نے ضیاء الحق سے اس ملاقات میں کہا تھا کہ یہ اقتدار عوام کی امانت ہے اور اس میں وہ خیانت نہیں کر سکتے۔

سردار سلیم نے چلتی گاڑی سے ہاتھ کا اشارہ کرتے بتایا کہ ضیاء الحق نے اس جیل کو توڑ کر پلاٹ بیچنے کا فیصلہ کیا تھا تا کہ ''بھٹو کی کوئی یادگار باقی نہ بچے'' ان کے مطابق پیپلز پارٹی کے ایک مرحوم کارکن اقبال نے پھانسی گھاٹ والی جگہ کا پلاٹ خریدنے کا فیصلہ کیا تا کہ بعد میں وہاں کوئی یادگار تعمیر کر سکیں۔

پیپلز پارٹی کے اس بانی کارکن نے بتایا کہ بعد میں پلاٹوں کی الاٹ منٹ منسوخ کر کے بے نظیر کے دور میں بھٹو پارک بنانے کا فیصلہ کیا گیا جب کہ اس جیل کی کافی زمین جرنیلوں کی رہائش کے لیے مختص کی گئی اور مرزا اسلم بیگ سمیت کئی جرنیلوں کے مکان اب اس جیل کی زمین پر موجود ہیں۔

راولپنڈی کی اس پرانی جیل اور موجودہ پارک کے ایک طرف صدر مشرف کی موجودہ فوجی رہائش گاہ اور ''مری بروری'' ہے تو دوسری جانب جھنڈا چیچی پل، جہاں صدر مشرف پر دو بار ناکام مگر خطرناک جان لیوا حملے ہوئے تھے۔ بھٹو کی پھانسی گھاٹ اور صدر مشرف کے حملے والی جگہ میں بہت ہی کم فاصلہ ہے۔

www.bhutto.org

بھٹو کا عدالتی قتل

لاہور ہائی کورٹ نے سابق چیف جسٹس آف پاکستان نسیم حسن شاہ پر سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مقدمہ کے مبینہ عدالتی قتل سے متعلق ایک آئینی درخواست باقاعدہ سماعت کے لیے منظور کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

لاہور میں پیپلز لائیرز فورم کے ایک وکیل حنیف طاہر نے دو ہفتے پہلے ایک آئینی درخواست ہائی کورٹ میں دائر کی تھی کہ جسٹس نسیم حسن شاہ کے خلاف سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل کا مقدمہ رجح کرنے کا حکم جاری کیا جائے۔

نسیم حسن شاہ بھٹو کو پھانسی کی سزا سنانے والے ججوں میں شامل تھے۔

اس آئینی درخواست کو ہائی کورٹ کے آفس نے اعتراض لگا کر واپس کر دیا تھا اور کہا تھا کہ بھٹو کے قتل کا فیصلہ سپریم کورٹ نے دیا تھا جس پر ہائی کورٹ میں آئینی درخواست منظور نہیں کی جا سکتی۔

اس اعتراض کے خلاف مدعی نے ہائی کورٹ سے دوبارہ رجوع کیا اور عدالت عالیہ کے جج ثاقب نثار نے اس آئینی درخواست کو اعتراض کے طور پر سنا اور اعتراض کو غیر قانونی قرار دے کر فیصلہ دیا کہ اس آئینی درخواست کی ہائی کورٹ میں باقاعدہ سماعت شروع کی جائے۔

درخواست گزار نے عدالت عالیہ سے کہا کہ اس نے یہ درخواست آئین کے آرٹیکل ایک سو ننانوے کے تحت ایف آئی آر درج کرانے کے لیے دائر کی ہے اور آئین کے تحت ہائی کورٹ کا دائرہ اختیار ہے کہ وہ ایف آئی درج کرنے کا حکم دے۔

اصل آئینی درخواست میں درخواست گزار نے جسٹس نسیم حسن شاہ کے حالیہ

www.bhutto.org

انٹرویو کو بنیاد بنایا کہ جس میں نسیم حسن شاہ نے کہا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمے میں ججوں پر دباؤ تھا جس کے تحت انھیں پھانسی کی سزا دی گئی۔ نسیم حسن شاہ نے یہ بھی کہا تھا کہ سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ مولوی مشتاق کو یہ مقدمہ نہیں سننا چاہیے تھا کیوں کہ ان کی بھٹو سے ذاتی دشمنی تھی۔

درخواست گزار نے نسیم حسن شاہ کے انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے عدالتِ عالیہ سے کہا کہ نسیم حسن شاہ نے خود اعتراف کیا ہے کہ بھٹو کا مقدمہ میں شک کا فائدہ انھیں ملنا چاہیے تھا اور یہ مقدمہ نرم سزا کے لیے موزوں تھا۔

درخواست گزار نے عدالت عالی سے نسیم حسن شاہ کے انٹرویو کی طرف توجہ دلائی ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ بھٹو کے وکلاء نے عدی کے ججوں کو ناراض کر دیا تھا اور یہ بھی ان کے خلاف فیصلہ کی ایک وجہ تھی۔

درخواست گزار کا کہنا تھا کہ ججوں کی ناراضگی کوئی قانونی بنیاد نہیں ہے سزا دینے کے لیے اور یہ انصاف کے منافی ہے۔

ان بنیادوں پر انھوں نے ہائی کورٹ سے استدعا کی ہے کہ وہ سابق چیف جسٹس نسیم حسن شاہ جو بھٹو کو قتل کے مقدمے میں سزا دینے والے ججوں میں شامل تھے، کے خلاف عدالتی قتل کی ایف آئی آر درج کرنے کا حکم جاری کرے۔

www.bhutto.org

ایک عہد ساز شخصیت

پاکستان کی تاریخ میں 4/اپریل کو جو ایک خاص مقام اور اہمیت حاصل ہے اس سے کوئی ذی شعور اور محب وطن پاکستانی انکار نہیں کرسکتا اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو ہی وہ شخصیت ہیں جو سامراج کے ذہن میں ایک کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا کیوں کہ استحصالی قوتوں کو کسی صورت بھی عوام کے حقوق کے علمبردار کا وجود برداشت نہ تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو بیسویں صدی میں عالم سیاست پر انتہائی گہرا اثر رکھنے والی شخصیات میں سے ایک ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے حامی اس کو پولین جمال عبدالناصر، سوئیکارنو اور ماؤزے تنگ جیسا رہنما جانتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو ہی وہ عظیم شخصیت تھے جنہوں نے استحصالی زدہ اور ظلم کی چکی میں پسنے والی اقوام اور افراد کو اپنے حقوق کی بازیابی کے لیے احتجاج اور بغاوت کا سلیقہ عطا کیا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ کی حیثیت سے، وہ سلامتی کونسل میں مظلوم کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے حصول کے لیے مجسم احتجاج بن گیا اور اس کا سلامتی کونسل میں گونجنے والا ایک ایک لفظ تاریخ کے صفحات میں سنہری حروف سے لکھا جاچکا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کو ایک نئی انقلابی فکر سے آشنا کر رہے تھے۔ غریبوں، بے کسوں اور پسماندہ طبقات میں جرأت اور شعور کی شمعیں روشن کر رہے تھے بلکہ وہ تیسری دنیا کے پسماندہ ملکوں اور قوموں کو نئی فکری جہتوں سے آشنا کر کے انھیں سپر طاقتوں کے استحصالی ہتھکنڈوں سے نجات دلاتے ہوئے ان کے خام مال کی منڈیاں بنے رہنے کے بجائے خود کار اقتصادی خوشحالی کے نئے نظام سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔

1974ء میں جب بھارت نے راجستھان کے مقام پر پہلا ایٹمی دھماکا کیا جو مملکت پاکستان کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج رکھتا تھا کیوں کہ پاکستان ہمیشہ سے ہی بھارتی

www.bhutto.org

جارحیت کا ہدف رہا ہے شہید ذوالفقار علی بھٹو نے اسی دن سے پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انھوں نے قوم سے تاریخی خطاب میں اعلان کیا تھا کہ ہم گھاس کھالیں گے، لیکن پاکستان کو ایٹمی طاقت بنائیں گے۔ پاکستان کے ایٹمی بم کے خالق پاکستانی قوم کے ہیرو ڈاکٹر عبدالقدیر خان بھٹو شہید کی دعوت پر ہی ہالینڈ سے پاکستان واپس آئے اور بھٹو شہید نے ان کو حکومت کی طرف سے ہرطرح کی سہولتیں فراہم کیں اور یوں کہوٹہ میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا آغاز ہوا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو ہی تھے جنہوں نے اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر کی پاکستانی ایٹمی پروگرام ختم کرنے کی پیشکش کو ٹھکرا کر نہ صرف امریکا سے بھرپور احتجاج کیا، بلکہ اس کے بدلے میں امریکی امداد لینے سے بھی انکار کر دیا۔ اس پر ڈاکٹر ہنری کسنجر نے ذوالفقار علی بھٹو کو عبرت ناک انجام کی دھمکی بھی دی۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو نے 1974ء میں پاکستان میں پہلی مرتبہ اسلامی سربراہان مملکت کی کانفرنس بلا کر نہ صرف ایک تاریخی کارنامہ سرانجام دیا، بلکہ اقوام مسلم کو ایک متحدہ اور متفقہ پلیٹ فارم بھی مہیا کیا جو آگے چل کر مغربی اقوام کی آنکھ میں کھٹکتا رہا۔ ہم پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی چیئرمین کی ملک و قوم کے لیے خدمات اور قربانی کو کسی صورت فراموش نہیں کر سکتے۔ ذوالفقار علی بھٹو کا سیاسی میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے انھیں جسمانی طور پر ختم کرنے کا فیصلہ وقت اور تاریخ نے غلط ثابت کر دیا ہے۔ اسلام آباد کے وزیراعظم ہاؤس میں رہنے والے ذوالفقار علی بھٹو سے گڑھی خدا بخش میں ابدی نیند سونے والا ذوالفقار علی بھٹو زیادہ طاقتور اور نامور ثابت ہوا پھر شہید ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف مقدمہ قتل کا سپریم کورٹ کا فیصلہ بھی متفقہ نہ تھا سات میں سے تین ججوں نے انھیں نہ صرف شک کا فائدہ دیا تھا بلکہ بالکل بے گناہ بھی ٹھہرایا تھا۔ موت برحق ہے اور ہر کوئی اس دنیا میں مرنے کے لیے آتا ہے۔ ظالموں اور غاصبوں کو عارضی کامیابی ضرور حاصل ہوتی ہے۔ مگر حق کی راہ میں جان دینے والے تاریخ میں ہمیشہ زندہ جاوید رہتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو شہید آج جسمانی طور پر دنیا فانی میں موجود نہیں، لیکن پاکستان کے کروڑوں عوام انھیں ہیرو کا درجہ دے چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آج بھی پاکستان کے عوام ذوالفقار علی بھٹو کی باتوں کو نہیں بھولے۔ تنگ نظر اور مفاد پرست مخالفین نے ان کے نام کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن ذوالفقار علی بھٹو شہید کی شخصیت کا جادو ہر دور میں مخالفین کے سر پر چڑھ کر بولا۔ آج اگر ہم ذوالفقار علی بھٹو

شہید کی پاکستان کے لیے سرانجام دی گئی خدمات کا شمار کرنے لگیں تو ان کی فہرست بہت طویل ہے انھوں نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے جنرل اسمبلی کے کئی اجلاسوں میں پاکستانی وفود کی قیادت کی۔ وہ 1966ء میں صدر ایوب خان مرحوم کی قیادت میں تاشقند جانے والے وفد کے رکن تھے اور بعد ازاں انھوں نے معاہدہ تاشقند کے بارے میں صدر ایوب خان سے اختلافات کی وجہ سے استعفیٰ دے دیا۔ 30 نومبر 1967ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی جو ان کی عظیم سیاسی جدوجہد میں سنگِ میل ثابت ہوئی پاک بھارت جنگ کے دور میں دسمبر 1971ء کو مسٹر بھٹو کو پاکستان کا وزیر خارجہ نامزد کیا گیا اور انھوں نے اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کی قیادت کی۔ 1972ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے اس وقت کی بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی سے تاریخی شملہ معاہدہ کیا اور اس معاہدے کے نتیجہ میں 93 ہزار جنگی قیدی پاکستان آئے۔ اپریل 1973ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کو مستقل متفقہ آئین دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے روس کے تعاون سے کراچی میں سٹیل مل کا سنگ بنیاد بھی رکھا۔

ذوالفقار علی بھٹو کو 1967ء میں ایران کی طرف سے نشان ہمایوں اول دیا گیا۔ 1965ء میں انڈونیشیا کا اعزاز آرڈر آف دی ڈے ری پبلک آف انڈونیشیا دیا گیا۔ 1966ء میں ارجنٹائن کا سب سے بڑا شہری اعزاز دیا گیا۔ ذاولفقار علی بھٹو شہید چھ کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

4 اپریل پاکستان کی تاریخ میں ایک اہم مقام اور حیثیت رکھتا ہے۔ اس دن پاکستان کے پہلے منتخب وزیر اعظم ایٹمی پروگرام کے خالق ذوالفقار علی بھٹو نے باطل قوت کے سامنے جھکنے کے بجائے پھانسی کے پھندے پر جھومنا مقدم سمجھا۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان بلکہ دنیا کی تاریخ میں امر ہوگیا، اب بھی وہ پاکستان کے کروڑوں عوام کے دلوں میں راج کرتا ہے۔ بھٹو شہید تیرا نام ابد تک زندہ رہے گا۔

www.bhutto.org

پیپلز پارٹی: انقلاب سے احتساب تک

یہ ایک ٹانگہ پارٹی تو نہیں بلکہ ایک ریل گاڑی ہے جس پر دوست اور دشمن کی تمیز کے بغیر لوگ سوار ہوتے اور اترتے ہیں۔

ایک ایسی پارٹی جس میں پاکستانی فوج کے سربراہ جنرل ٹکا خان بھی تھے تو کمیونسٹ پارٹی کے سابق سیکرٹری جنرل جام ساقی بھی۔ اعتزاز احسن بھی ہیں تو مبین پھلپوٹو بھی اور شیری رحمان بھی۔

ایک ایسی پارٹی جو پاکستانی اقتدار اور منظر نامے پر آئی تو مجرے کرتی ہے اور جاتی ہے تو ماتم کرتی ہے۔ چھنانن چھن چھن چھنا چھنان نن چھن پائل باجے، یا حسین وائے حسین۔

ہے ری سیاست تو بھی ایک عجوبہ روزگار پختہ عمر نائکہ ہے جس سے نفرت کرنے والے بھی ایک دفعہ ساتھ سونے کی خواہش ضرور رکھتے ہیں۔

نومبر انیس سو ستر سٹھ میں لاہور میں قائم ہونے والی یہ پاکستان کی سیاسی جماعت اب انتالیس برس کی ہو چکی ہے۔ پاکستان اور پاکستان سے باہر انیس سو ساٹھ کی یادگار و ہنگامہ خیز دہائی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور حالات ایوب خان سے ناراض ہو کر مستعفی ہونے والے وزیر خارجہ بھٹو کی طرف سے ایک نئی سیاسی پارٹی بنانے کے لیے موزوں تھے۔ ہندوستان، پاکستان جنگ کے خاتمے پر تاشقند معاہدے پر پاکستانی عوام کا رد عمل، ایوب خان کی آمریت کے خلاف چھوٹے بڑے سیاسی گروپوں، پارٹیوں، طالب علموں اور مزدوروں کی بڑھتی ہوئی بے چینی اور ابھرتی ہوئی تحریک، مہنگائی اور ریاستی جبر، ون یونٹ کی عوامی سطح پر مخالفت، پاکستان سے باہر عرب اسرائیل جنگ، ویتنام جنگ اور اس کا امریکا اور دنیا بھر میں ردعمل، بائیں بازوں سمیت نت نئے سیاسی اور سماجی نظریات، بھٹو کے

www.bhutto.org

اپنے آبائی صوبے سندھ اور مشرقی بنگال میں اٹھتی ہوئی قوم پرستانہ طلبہ اور متوسط طبقے میں لہر، یہ ایسی باتیں تھیں جس نے ایوب خان کے گورنر نواب امیر محمد آف کالا باغ سے ڈر کر یورپ نکل جانے والے سندھی نوجوان وڈیرے ذوالفقار علی کو لوگوں کی زبان میں ''بھٹو ساڈا شیر اے'' بنا دیا۔

لیکن یہ سابق پاکستانی سفارتکار اور سوشلسٹ سوچ رکھنے والے جے اے رحمٰن تھے جنھوں نے بھٹو کی پارٹی کا منشور (جس پر کبھی عمل نہیں ہوا) لکھا۔ ایک سخت روایتی پاکستانی معاشرے میں بھٹو نے سوشلزم وہ بھی اسلامی نعرے کو لوگوں میں ''روٹی کپڑا اور مکان'' کے پُرکشش نعرے میں خوب بیچا۔ یہ سندھی میراثی اور مارکس کا ملاپ تھا جو پاکستانی سیاست کو پہلی بار چودھری کے ڈیرے اور وڈیرے کے اوطاق، خان اور ملا کے حجرے سے نکال کر بھائی چوک، لیاقت پارک، ککری گراؤنڈ میں لے آیا۔

یہ وہ دن تھے جب ایوب خان کے ڈر سے بھٹو کے جاگیردار اور وڈیرے دوست اس کی میزبانی سے اپنے ہوٹل اور گھر چھوڑ کر بھاگ جاتے۔ لیکن قاضی فیض محمد، امداد محمد شاہ اور تالپور برادران جیسے لوگ اس کے میزبان بنے۔

شیخ رشید، ڈاکٹر مبشر حسن، خورشید حسن میر، معراج محمد خان، غلام مصطفیٰ کھر، ملک معراج خالد، حیات محمد خان، شیر پاؤ، تالپور برادران، ممتاز بھٹو، عبدالحفیظ پیرزادہ، اداکار طارق عزیز، مخدوم طالب المولیٰ، حنیف رامے، میاں محمود علی قصوری یہ بھٹو کی پیپلز پارٹی کی ٹرین پر سوار ہونے والے پہلے لوگ تھے جن میں سے اکثر اس کے تاسیسی اجلاس میں بھی شریک تھے۔

بھٹو کی اس پارٹی کے نام پر پہلے بھی سر شاہنواز بھٹو، غالباً میاں افتخار الدین اور جی ایم سید نے بھی انیس سو پچاس کی دہائی میں پیپلز پارٹی قائم کی تھی۔

لاڑکانے یس لیڈر نکلا حیدری ہتھیار لیے.
مرد مجاہد ہے کھڑا شیر پر یوں تلوار لیے

میر پور ماتھیلو کے ایک مقامی لوک فنکار علی گل مہر نے ان دنوں میں یہ کلام کہا تھا۔

لیکن بھٹو کی نئی پارٹی میں معراج محمد خان اور طارق عزیز جیسے لوگوں کا نعرہ تھا ''انتخابات نہیں انقلاب'' یا ''پرچی نہیں برچھی''، جس پر پاکستان پیپلز پارٹی کے مشہور ہالا

www.bhutto.org

کنونشن میں بھٹو کی موجودگی میں کافی ہنگامہ ہوا تھا۔

وہاں بھٹو نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ نہیں جانتے امریکا کتنا طاقتور ہے وہ بلوچستان میں گوریلا لڑائی کو سیٹلائیٹ کے ذریعے دیکھ رہا ہے۔

اسی ہالا کنونشن میں نوجوانوں نے وڈیروں اور جاگیرداروں کی پیپلز پارٹی میں شمولیت پر اعتراض کیا تھا جو انہی دنوں میں تھوک کے بھاؤ اپنے ہزاروں ساتھیوں، قبیلے اور ڈھوروں ڈنگروں و مرغوں! کے ہمراہ جیسے اعلانات کے ساتھ پیپلز پارٹی میں شامل ہو رہے تھے۔

''نواب شاہ اور مورو میں جاگیرداروں کی عورتیں بھی کسانوں کی عورتوں کے ساتھ کپاس چنیں گی، یا ''اقتدار میں آنے پر میرے وزیر لیاری کی گلیوں میں جھاڑوں دیں گے'' یا ''ملیں مزدوروں کی زمینیں کسانوں کی'' جیسی بھٹو کی تقریریں اور نعروں نے ان کی پارٹی کو پاکستان کے لوگوں میں انتہائی مقبول بنا دیا تھا۔ ملاؤں کی اس پروپیگنڈا اور ان پر کفر کی فتوؤں کے باوجود کہ ''سوشلزم کا مطلب بہن کی شادی بھائی کے ساتھ''۔

تھری پیز (پی پی پی) کا نام سن کر کوئی جل گیا تو کسی نے دُعا دی۔ کسی نے اسے ''پلاٹ پرمٹ پارٹی کہا تو کیس نے پیو اور پلاؤ پارٹی''۔

انیس سو ستر کے انتخابات کے نتائج میں پیپلز پارٹی تب کے مغربی پاکستان میں سب سے اکثریتی پارٹی بنکر جیت کر آئی تھی۔ لیکن انیس سو ستر کے انتخابات سے لے کر آج تک پیپلز پارٹی (باوجود اس کی ضیاء الحق کی گیارہ سال آمریت سے بڑی لڑائی لڑنے کے) نام نہاد احتساب کی تلوار کے سائے میں فوجی جرنیلوں سے اقتدار کی رسائی کے لیے ساز باز کرنے میں ہی مصروف کار نظر آئی ہے۔

www.bhutto.org

قائدعوام کی قبر سے آزادی اور ترقی کا لازوال پیغام

ذوالفقارعلی بھٹو ایک عہد ساز شخصیت تھے وہ یونیورسٹی اور سدرن کیلی فورنیا لاس اینجلس میں 1947ء سے 1949ء تک زیر تعلیم رہے۔ یونیورسٹی اور کیلی فورنیا بارکلے سے 1950ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور یونیورسٹی آف آکسفورڈ برطانیہ سے ایم اے کی ڈگری 1953ء میں حاصل کی اسی سال انھوں نے لنکن ان لندن سے بار ایٹ لاء کیا۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز وکالت سے کیا اور اپنی سیاسی زندگی کی ابتداء اقوام متحدہ کے وفد بطور کن شمولیت سے کی۔ قائدعوام ذوالفقارعلی بھٹو عام انتخاب کے بعد پہلے منتخب وزیراعظم بنے۔ تعلیم یافتہ اور ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہترین مقرر بھی تھے اپنے سیاسی کیریئر کے دوران وہ وفاقی وزیر سائنس وٹیکنالوجی اور امور خارجہ رہے۔ اور انھوں نے اس دوران ان محکموں میں انقلابی اقدامات کیے وزارتِ عظمیٰ کے عہدے تک پہنچنا ان کی کامیاب شخصیت کی علامت ہے۔ کہنہ مشق سیاست دان ہونے کے باعث ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ قائداعظمؒ کے بعد انھیں سب سے بڑا رہنما مانا جاتا ہے۔ سیاسی افق پر ان کی قد آور شخصیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

ذوالفقارعلی بھٹو شہید نے پاکستان اسلامی دنیا اور تیسری دنیا کے عوام کی جس جرأت اور دلیری اور جذبے سے ترجمانی کی وہ ہماری کتاب تاریخ کا درخشاں عنوان ہے۔ اگر ہم بھٹو کے کارناموں پر روشنی ڈالنا شروع کریں تو طویل وقت درکار ہوگا۔ تاہم مختصراً قائدعوام کی چند باتیں اس موقع کی مناسبت سے آپ کی خدمت میں عرض کرتا ہوں۔ بھٹو نے اپنی سیاسی بصیرت سے عالمی سیاست کو 1962ء میں بھانپ لیا تھا جس کو سامنے رکھ کر آپ نے چین کا دورہ کیا اور پاک چین دوستی کی وہ مستحکم بنیاد ڈالی جو وقت کے ساتھ ساتھ

مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی ہے۔ 1965ء کے میدان میں جیتی ہوئی جنگ جب ایوب خان نے تاشقند میں معاہدہ تاشقند کی صورت میں ہاردی تو بھٹو نے ایک لمحہ بھی حکومت میں رہنا گوارہ نہ کیا اور دوسری بڑی وزارت سے مستعفی ہوگئے۔

قائداعظم محمد علی جناح کی رحلت اور قائد ملت لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد سیاست بڑے بڑے جاگیرداروں، سرداروں، خانوں، نواب زادوں، اور ان کی پر اسرار حواریوں میں قید ہوگئی تھی ملک کی تقدیر کے فیصلے ڈرائنگ رومز میں ہوتے تھے۔ وزارتیں ذاتی مفادات اور حکمران طبقات کی پسند اور ناپسند پر رات کی تاریکی میں بنتی اور ختم ہوتی تھیں پھر جب ایوب کی مارشل لاء کی بساط الٹ گئی تو عوام کے لیے سیاسی عمل کے دروازے کھل گئے اس سے قبل ملک کے تمام معاشی وسائل بائیس خاندانوں کے زیر تسلط تھے۔عوام کے مفادات سے بے اعتنائی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اس وقت قائدعوام ذوالفقارعلی بھٹو نے تمام مروجہ روایات سے بغاوت کرتے ہوئے پاکستان پیپلز پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا۔

آپ کا انداز سیاست شروع سے عوامی تھا لیکن مسلم لیگ کی سیاست خواص کی سیاست تھی۔ چنانچہ آپ نے نئی جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی اور سیاست اور مذہب کو یکجا کر دیا۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ ''جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' انھوں نے اسلام ہمارا دین ہے۔ جمہوریت ہماری سیاست ہے، اسلامی سوشلزم ہماری معیشت ہے، طاقت کا سرچشمہ عوام اور اب شہادت ہماری منزل کا عالمگیر نعرہ دیا اور پاکستان کی سیاست میں ایک ارتعاش ایک زلزلہ برپا کر دیا۔ پسے ہوئے عوام کو شعور کی وہ نعمت اور دولت عطا کی کہ بڑے بڑے برج دھڑام سے گر گئے۔ پی پی پی کی بدولت وہ نہ صرف اقتدار میں آئے بلکہ یہ پاکستان کی جمہوریت سیاسی برداری کے لیے ایک بے مثال ورثہ کی بھی حیثیت رکھتی ہے۔حتیٰ کہ آج کے دن تک ہر طرح کے دباؤ کے باوجود پی پی پی کے کارکن بے نظیر بھٹو کے ساتھ کھڑے ہیں اور اکتوبر 2002ء کے دھاندلی زدہ انتخابات میں انھیں سب سے زیادہ ووٹ دے کر ان کے والد کے اس ورثہ کے ساتھ پختہ وابستگی کا اظہار کر چکے ہیں۔

تیسری دنیا جو اقتصادی بدحالی کا شکار تھی بھٹو شہید نے اسے جینے کا سلیقہ سکھایا اور تنظیم کی صورت میں ترقی یافتہ ممالک کے سامنے کھڑا کیا۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو شہید کا ذہن آزادی کے نور سے جگمگاتا تھا۔ اس نے کبھی کسی سے ڈکٹیشن نہیں لی۔ گرومیکوی روسی نظام کا دماغ تصور کیا جاتا تھا مگر بھٹو کے قریب آ کر بات کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ہنری کسنجر جیسے امریکی وزیر کو بھی کبھی سر پر نہیں چڑھایا اور یہی رفعتیں ایسے عظیم پاکستانی لیڈر کے طور پر متعارف کراتی رہیں۔ اس قدر معزز رہبر اہل پاکستان کو بھٹو شہید کے بعد نصیب نہیں ہوا تھا مگر قدرت نے اسی خاندان سے محترمہ بے نظیر بھٹو کو افق پاکستان پر جلوہ گر کیا۔ جو اعلیٰ سوچ کی دولت سے مالا مال ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے قوموں کی برادری سے تعلقات کے لیے نئی جہتیں تلاش کیں اور دو طرفہ برابری کی بنیاد پر روابط کی داغ بیل ڈالی جس سے ملکی وقار اور قومی ساکھ میں اضافہ ہوا، اور اسی نظریہ کی بدولت بین الاقوامی سطح پر معاہدات کا آغاز ہوا اور اس طرح پہلی بار اہل وطن کو احساس دلایا گیا کہ عظمت اور قومی آن بان کی اساس آزادی ہے۔

4/اپریل 1979ء پاکستان کی تاریخ کا سیاہ دن تھا جب چند خوفزدہ حکمرانوں نے کروڑوں عوام کے قائد کو جسمانی طور پر ان سے چھین لیا لیکن دلوں میں بسنے والا ان خوفزدہ افراد کو ہمیشہ کے لیے نامراد کر گیا اور سندھ ریگ زار کے علاقے گڑھی خدا بخش ابدی نیند سونے والا شہید ذوالفقار علی بھٹو عوامی سیاست اور تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔ آج پورے ملک اور پوری دنیا میں جہاں پاکستان زیر بحث آتا ہے وہاں ذوالفقار علی بھٹو کا نام لازمی ہے۔ گذشتہ 25 سالوں میں بھٹو شہید کی شہادت کے بعد بھٹو شہید کا فلسفہ اور افکار مورخ بحث کا اہم حصہ ہیں خصوصاً پاکستان کی سیاست کا محور بھٹو شہید کا فلسفہ نوجوانوں کے لیے آئیڈیل ورکنگ کلاس کے لیے رہنما پسے ہوئے طبقات کا ترجمان اور خواتین کے لیے محافظ عالم اسلام کے لیے ایک محبت کرنے والا دوست اور بساط عالم پر بطور دانشور تسلیم ہوا۔

پاکستان کے عوام 4/اپریل کو ذوالفقار علی بھٹو شہید کی 28 ویں برسی کے موقع پر انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں چار اپریل ایک ایسا دن ہے جب پاکستان کی عوام ذوالفقار علی بھٹو کو یاد کرتے ہیں وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے صدر کا عہدہ اس وقت سنبھالا جب پاکستان 1971ء کے سانحہ سے دوچار تھا قوم اس وقت منقسم اور مایوس تھی جب ہمارے نوے ہزار فوجیوں نے دشمن کے سامنے ہتھیار پھینکے۔ یہ وہ وقت تھا جب جنرل مانک شاہ اپنی قوم سے یہ وعدہ کر رہے تھے کہ وہ آئندہ مہینوں میں انھیں ایک سرپرائز دیں گے۔

www.bhutto.org

شکست خوردہ آوازیں یہ کہہ رہیں تھی کہ اب پاکستان کی بقا ناممکن دکھائی دے رہی ہے قائد عوام نے شکست خوردہ قوم کو حوصلہ دیا اور عوام سے وعدہ کیا کہ وہ مایوس نہ ہوں۔ پاکستان کو دنیا میں باعزت مقام دلائیں گے فوج کو طاقتور اور نوجوانوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں گے۔ بالآخر بھٹو نے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرلی۔

قائد عوام کی قبر سے آزادی اور ترقی کا لازوال پیغام درہ خنجراب کی پہاڑیوں سے خیبر تک اور بحیرہ عرب کے ساحلوں سے کراچی تک لاکھوں دلو میں گونجتا ہے یہ ان لوگوں کی جدوجہد میں بھی دیکھا جاسکتا ہے جو قید ہوئے جلاوطن ہوئے اذیت کا شکار ہوئے۔

آنے والی نسلیں ان سے سبق حاصل کریں اور حوصلہ عزت اور اُمید کے ساتھ زندہ رہیں چار اپریل کو ہر وہ شہری جو قائد اعظمؒ کے پاکستان پر یقین رکھتا ہے وہ قائد عوام اور تمام معلوم یا نامعلوم مرد و زن جنھوں نے اپنے خون پسینہ اور آنسو دیے ان کو خراج عقیدت پیش کیا جائے۔

ذوالفقار علی بھٹو کو پاکستان سے محبت کرنے کے جرم میں سزائے موت کا مجرم قرار دیا گیا تھا جب یہ فیصلہ ہوا تو ہر محب وطن کی آنکھ اشک بار تھی اور زبردست خانہ جنگی کا بھی خطرہ لاحق ہوگیا تھا عالمی قائدین جمی کارٹر، والڈ ہائم، اکیلا ہان، بلند اجوت، اندرا گاندھی، چندر شینکھر، فن لینڈ کے وزیراعظم اور ایمنسٹی انٹرنیشنل اور عالمی جیورسٹ کمیشن نے بھی اس فیصلے کو قانون و انصاف کا قتل قرار دیا تھا۔ عظیم لیڈر ذوالفقار بھٹو نے جون 1978ء کو زندان سے اپنی پیاری بیٹی بے نظیر بھٹو کو ایک خط کے ذریعے وصیت کی کہ تم میری لڑائی مجھ سے بہتر طریقے سے لڑنا تمہاری تقریروں میں مجھ سے زیادہ جوہر خطابت ہو تمہاری پاک دھرتی کی عوام سے مکمل وابستگی کبھی کم نہیں ہونی چاہیے اور میری دعا ہے کہ تم اپنے پاک وطن کے عوام اور ملک کی ترقی امن و سلامتی قائم رکھنے جیسے مقدس مشن میں ہمیشہ جرات مند اور کامیاب و کامران ہو۔ ذوالفقار علی بھٹو نے تخت سے لے کر صرف عوام کی خوشحالی اور پاکستان کی ترقی کے لیے نہ صرف کوشش کی بلکہ کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی یہ کوشش اور قربانیاں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں جنہیں ہمیشہ خراج تحسین پیش کیا جاتا رہے گا۔

www.bhutto.org

دورِ جدید کی عظیم مسلم شخصیت

پاکستان کے جدت پسند رہنما قائدعوام ذوالفقارعلی بھٹو نے ایک تاریخ پر گہرے نقش ثبت کیے ہیں۔ انھیں اس بات کا اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے ملک کو 1973ء کا متفقہ آئین دیا۔ 1972ء میں شملہ معاہدہ کیا جس نے پاکستان اور ہندوستان میں دیرپا امن قائم کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ طبقات سے پاک معاشرہ قائم کرنے کے لیے سماجی اصلاحات کیں۔ غیر جانبدار خارجہ پالیسی، ایٹمی پروگرام اور ملک کے لیے سماجی، معاشی اور عسکری انفراسٹرکچر کی تعمیر ان کے ناقابل فراموش کارنامے ہیں۔ وزیراعظم ذوالفقارعلی بھٹو اعلیٰ پائے کے دانشور تھے۔ وہ ایک مفکر، ادیب اور خطیب تھے۔ وہ مصمم ارادوں کے پیکر، دور اندیش، اہلیت سے مالا مال، دیانتدار، ترقی پسند اور اپنے وعدوں کی ہر حال میں پاسداری کرنے والی شخصیت تھے۔ وہ معاشرہ کے ستائے ہوئے محروم طبقوں اور غریبوں کے دوست تھے۔ وہ ایک ایسی عوامی شخصیت تھے جنھوں نے اپنے عقائد کی بلا خوف و خطر پاسداری کی اور اللہ کے سوا کسی بھی طاقت کے سامنے سرنگوں ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کی اس جرأت و جوانمردی نے جو انھیں ان کے عقیدہ نے عطا کی جس کی وجہ سے انھوں نے شہادت کی موت کو گلے لگانا پسند کیا۔ ان کے عقیدہ و ایمان میں انسانیت کی آزادی ایک بنیادی نکتہ تھا۔ ان کے دور حکومت میں پاکستان نے افریقی اقوام کی اعلانیہ اور پوشیدہ ہر قسم کی حمایت کی جو اس وقت نسل پرست اقلیت کے زیر تسلط تھیں۔ قائدعوام اتحاد بین المسلمین کے داعی اور دور اندیش تھے۔ ان کے نظریہ اتحاد بین المسلمین میں ایک کامل جدید مسلمان کی جھلک نظر آتی تھی۔ نظریہ اتحاد بین المسلمین پر یقین رکھنے والے رہنما کے طور پر ایک مسلم امہ کے خواہاں تھے وہ چاہتے تھے کہ یورپ کے ساحلوں سے لے کر افریقہ اور

ایشیا تک پھیلی ہوئی ایک مسلم قوم ہو اور اس کی ایک ہی فوج ہو۔ تاہم وہ ایک جدت پسند تھے اور نیشنلزم کو فاشزم جیسے نظریات کے خلاف اتحاد کو بہت اہمیت دیتے تھے۔

قائد عوام نے ہر مسلمان کو ایک احساس تفاخر عطا کیا۔ وہ تیسری دنیا کے ایک ہیرو تھے جس نے سامراجیت، نوآبادیت اور نسل پرستی کے خلاف نہایت جرأت مندانہ آواز بلند کی انھوں نے بلاخوف وخطر اقوام کی حریت وآزادی کے حقوق کا دفاع کیا۔ 1973ء میں جب افغان جنگ کا آغاز ہوا تو انھوں نے پاکستانی فوج کو مسلم ممالک کی سرحدوں کے دفاع کے لیے بھیجا جس میں شام کی گولان پہاڑیاں بھی شامل تھیں۔ قائد عوام کی مختصر پچاس سالہ زندگی مختلف بین الاقوامی، علاقائی اور قومی خدمات میں صرف ہوئی قائد عوام کا سب سے اہم ترین اور دیرپا ورثہ عوام میں جمہوریت سے متعلق شعور و آگہی اجاگر کرنا تھا۔ انھوں نے عوام کو بیدار کیا تھا اور انھیں اس بات کا احساس دلایا کہ وہ سیاسی قوت کا سرچشمہ ہیں۔ انھوں نے کسانوں، صنعتی کارکنوں، خواتین اور عوام کو ان کے حق رائے دہی کی اہمیت کا احساس دلایا جس کے ذریعے عوام اپنی زندگیوں میں یقینی طور پر بہتری لاسکتے ہیں۔

قائد عوام نے جمہوریت اور جمہوری اقدار کی دل و جان سے پاسداری کی اور بالآخر اپنی زندگی کو آزادی کے لیے قربان کر دیا۔

1969ء میں جب پاکستان کے عوام ایوبی آمریت کو نکال باہر کرنے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے شہید ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور ہائی کورٹ میں عوام کے جمہوری حقوق کا دفاع کرتے ہوئے انھوں نے کہا ''مائی لارڈ! جمہوریت یقیناً ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند ہے، موسم بہار کے پھولوں سے بکھری خوشبو کی طرح ہے۔ یہ آزادی کا نغمہ ہے جسے چھو کر دیکھنے کے بجائے محسوس کرنا زیادہ پرلطف ہے لیکن محسوسات سے بڑھ کر جمہوریت بنیادی حقوق ہیں یہ حق رائے دہی، بیلٹ کی حفاظت، آزاد پریس، آزاد تنظیمیں، خودمختار عدلیہ، مقننہ کی بالادستی، انتظامیہ پر کنٹرول اور دیگر متعلقہ شرائط جو موجودہ نظام میں مکمل ناپید ہیں۔''

ٹالسٹائی نے ''وار اینڈ پیس'' کے آخری حصے میں لکھا ہے کہ تاریخ نظریات کی ایک تحریک ہے جس میں سیاسی رہنما بہت مختصر کردار ادا کرتے ہیں۔ اس میں اضافہ کو کچھ اس طرح سے کیا کہ بعض اوقات نظریات کی تحریک درحقیقت بہت برق رفتار ہوتی ہے تاہم کسی وقت نظریات کی تحریک برف کے تودے پگھلنے کی رفتار سے کم پڑ جاتی ہے۔ نظریات

www.bhutto.org

کی تحریک کو ایک فعال سیاسی اور جمہوری کلچر میں بہت جلاء ملتی ہے ہاں اختلاف رائے کو برداشت کیا جاتا ہے آمرانہ معاشروں میں تاریخ منجمد رہتی ہے۔ پاکستان، قائد عوام سے پہلے بالکل ایسا ہی تھا۔ وہ ان میں سے ایک تھے جنھوں نے اس جمود زدہ آمریت میں جکڑے ہوئے معاشرہ کو ایک فعال اور متحرک جمہوری معاشرہ میں تبدیل کردیا اور اس کی قیمت انھوں نے اپنی قیمتی جان کا نذرانہ دے کر ادا کی۔ وہ اس فوجی حکومت کے سامنے سینہ سپر ہوگئے جو ان کے خیالوں میں معاشرہ کو ایک سرطان کی طرح کھا رہی تھی۔ پاکستان کے تناظر میں انھوں نے مشاہدہ کیا کہ فوجی آمریت ملک کے عوام کے حقوق رائے دہی کی نفی ہے حالانکہ یہ ملک ایک جمہوری طریقے سے حاصل کیا گیا تھا۔

سرد جنگ کے ایام میں بحر ہند کے گرم پانیوں کی طرف سوویت یونین کی نگاہیں مرکوز ہو چکی تھیں اور اس کا اتحادی بھارت کشمیر پر قابض ہو چکا تھا اور وہ ایک مضبوط دفاعی حصار قائم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ پاکستان کو ناقابل تسخیر بنانے میں ان کا کردار ایٹمی پروگرام شروع کرنے کے ساتھ ساتھ کامرہ ایرو نائیکل کمپلیکس کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے انھوں نے ہیوی مکینیکل کمپلیکس ٹیکسلا تعمیر کیا اور سقوط ڈھاکہ کی شرمناک شکست سے دوچار مسلح افواج کا مورال بحال کیا۔ وہ نوے ہزار جنگی قیدیوں کو بھارتی کیمپوں سے واپس لائے اور 1971ء کی جنگ میں چھینے گئے پاکستانی علاقوں کو واپس حاصل کیا۔ انھوں نے ان جرنیلوں کو جنگی ٹرائل سے محفوظ رکھا جنھوں نے ملک کا نام اور عزت بچانے کے لیے نسل کشی کی۔ انھوں نے مسلح افواج کو ان چند بدمست جرنیلوں سے بچایا جنھوں نے اپنے جاہ و اقتدار کو تقویت دینے کے لیے ملکی وقار اور سالمیت کو داؤ پر لگایا۔ بھٹو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ فوج کی سیاسی معاملات میں مداخلت اس ادارہ کی پیشہ ورانہ استعداد کے لیے نقصان دہ ہے۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ ''پاکستان کی مسلح افواج ایک لمحے کے لیے بھی اپنی توجہ اپنی ذمہ داریوں سے ہٹانے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ پاکستان کی سالمیت کے نام پر وہ ملک کی سیاسی زندگی میں ملوث ہونا یا مدغم ہونا کسی طور پر برداشت نہیں کرسکتی۔ وہ فوجی جنھوں نے اپنی بیرکس چھوڑ کر حکومتی محل سراؤں میں رہائش اختیار کی اور جنگ ہار گئے اور جنگی قیدی بنے جیسے کہ 1971ء میں ہوا۔ ان کے لفظوں کی صداقت اس وقت ثابت ہوگئی جب 1981ء میں جنرل ضیاء نے سیاچن گلیشیئر گنوا دیا اور دوبارہ 1999ء میں پاکستان نے

www.bhutto.org

کارگل سے یکطرفہ پسپائی اختیار کی حتیٰ کہ اپنے فوجیوں کی لشاوں تک کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ یہ صداقت ایک مرتبہ پھر 2001ء میں ثابت ہوئی جب پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شمولیت اختیار کی اور صرف اس لیے کہ شمالی اتحاد کابل میں تبدیلی لائے گا۔ بہت سے ایسے لوگ تھے جو کہتے تھے کہ بنگلہ دیش بننے کے بعد مغربی پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ پاکستان نے 1971ء میں ایک قابل اور ذہین شخص کی رہنمائی میں دوبارہ جنم لیا۔ ان کی عظمت یہ تھی کہ انھوں نے ایک دل شکستہ قوم کو ہمالیہ کی بلندیوں کی جانب رواں دواں کیا انھیں تحریک دی کہ وہ آسمانوں اور ستاروں کو چھولیں۔ پاکستان مسلم دنیا کا ایک ایسا مرکز بن گیا جہاں عالم، سائنس دان، ثقافت اور ادب کے بڑے نام اپنی توانائیاں عظیم تر بھلائی کے لیے استعمال کر رہے تھے دنیا کے مدبر رہنماؤں نے بھٹو کو سراہا انھوں نے اس جدید مسلمان میں وہ خوبیاں دیکھیں جو دنیا کو امن و ترقی کی راہ پر از سر نو تشکیل دینے میں مدد دے سکتا تھا۔ قائد عوام کی روشن فکر زندگی نے پاکستان کو توانائی اور طاقت عطا کی۔ ملک کی مقصدیت کے ساتھ لگن جو کہ نظریات سے ہم آہنگ تھی، شرح پیداوار میں اضافہ ہوا اور ملک میں بیرونی دنیا سے دولت آئی۔ مسلم ممالک سالانہ 500 ڈالر پاکستان کو عطیہ کر رہے تھے جس کی وجہ سے اس کا بین الاقوامی مالیاتی اداروں پر انحصر کم ہوگا۔ لوگوں کو روزگار کے مواقع میسر آئے۔ انھوں نے ''ھیومن کارپس'' یا بنیادی انسانی حقوق کو متعارف کروایا۔ مُلک کی خواتین کو روایتی سماجی رکاوٹوں سے نجات ملی اور انھیں پولیس، فارن سروس اور ماتحت عدالتوں میں ملازمتیں ملیں۔

انھوں نے آمروں کو بھی خبردار کیا کہ وہ بنیادی جمہوریت کے بجائے جمہوریت کو اختیار کریں۔ انھوں نے کہا ''ہم جمہوریت کا مطالبہ کرتے ہیں اور انھوں نے ہمیں بنیادی جمہوریت دی'' اگر بنیادی جمہوریت ایک جمہوریت ہے تو پھر ہر ملک نے اسے کیوں کر اپنایا۔ اگر یہ ایک اچھا نظام ہے تو پھر پوری دنیا کو اس نظام کو اپنانا چاہئے تھا۔ لیکن پوری دنیا میں کہیں بھی اس طرز کا نظام نہیں ہے۔ نہ امریکا میں، نہ برطانیہ، نہ فرانس، نہ بھارت، نہ چین، نہ روس میں۔ تب ہمیں بتایا گیا کہ یہ حیران کن نظام ہے۔'' ان کے سامنے ایک آمر کی جائزیت کو بنیادی جمہوریت کے ذریعے جہاں ضلعی کونسلیں الیکٹرول کالج تھیں کے ذریعے حاصل کیا گیا۔ ان کی جدوجہد کے بعد بنیادی جمہوریت عوام کی نظروں میں اپنی

www.bhutto.org

وقعت کھو بیٹھی اور انھوں نے دیکھا کہ یہ ان کی حق رائے دہی پر ایک ڈاکا ہے۔

وہ اپنی اقدار کے ساتھ دلی وابستگی رکھتے تھے۔ جب وقت آیا تو انھوں نے نظریات پر سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا اور اپنی جان قربان کردی۔ وہ بڑی محبت سے کہا کرتے تھے ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' وہ شیر کی طرح جرأت مندی سے زندہ رہے اور ایک شیر کی طرح موت کو گلے لگایا۔ انھوں نے کہا ''میں دکھاؤں گا کہ ایک عوامی رہنما کس طرح زندہ رہتا ہے اور مرتا ہے'' اور انھوں نے کر کے دکھایا۔ دنیا نے ان کی زندگی کو بچانے کی اپیلیں کیوں کہ دانشورانہ قابلیت جو انھوں نے دنیا کو امن و ترقی کے لیے دی، دنیا بھر کے لوگوں کے لیے وہ ایک قابل قدر شراکت تھی۔ لیکن ایک خوفزدہ آمر نے سپریم کورٹ آف پاکستان کی متفقہ آواز کو انھوں نے قائد کی زندگی بخشنے کے لیے کی تھی نظر انداز کرتے ہوئے آدھی رات کو سزا پر عمل درآمد کرنے کے آرڈر جاری کر دیے۔ ان کے آخری الفاظ یہ تھے ''میں بے گناہ ہوں۔''

وزیراعظم بھٹو بہت بہادری سے تابوت میں گئے اور دنیا یہ سن کر ششدر رہ گئی کہ اس نے اپنے سب سے پیارے فرزند کو کھو دیا۔ قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس قتل کی بھرپور مذمت کی گئی بھٹو یہ دنیا چھوڑ کر تاریخ کے اس مقام پر آج فائز ہیں جہاں ان شخصیتوں کو رکھ جاتا ہے جنھوں نے تاریخ کو اپنے انداز میں ڈھالا۔ ان کی شہادت نے دنیا کے بہت سے ممالک میں آزادی کی تحریکوں کو قوت بخشی۔ دنیا بھر کے لوگ اس قتل کی مذمت کے لیے اپنے دارالحکومتوں میں سراپا احتجاج بن گئے۔ تاریخ کے ایک زیرک طالب علم کی حیثیت سے وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ ابدی زندگی اس میں ہے کہ مقصد کی خاطر قربانی دی جا۔ اور تمام مقاصد میں سب سے بڑا مقصد انسانیت کو آمریت اور ظلم سے آزادی دلانا ہے قائد عوام 1928ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 1979ء میں شہادت پائی ابھی تک لوگوں کے اذہان اور قلوب میں کسی روشن ستارہ کے مانند جگمگا رہے ہیں وہ ان کے لیے تحریک ہیں جو جیلوں میں ظلم و جبر کی اسیری کاٹ رہے ہیں۔

www.bhutto.org

حریت کا عظیم رہنما

ایک رہنما کی تربیت

5 جنوری 1928ء کو سرشاہنواز بھٹواور لیڈی خورشید بھٹو کے ہاں ایک بیٹے کی ولادت ہوئی اس کا نام دنیا بھر کے غریب عوام کے اذہان اور قلوب میں زندہ جاوید ہے، وہ نام ہے ذوالفقار علی بھٹو۔ ذوالفقار علی بھٹو سامراجیت کے مخالف آخری رہنما تھے۔ کتاب ''آزادی موہوم'' کے مصنف کی زندگی اور موت ایک امر ہو جانے والی کہانی بن گئی۔

آج مسلم امہ نازک دور سے گزر رہی ہے عراق، افغانستان، فلسطین اور کشمیر میں قتل عام جاری ہے آج عالم اسلام کو ذوالفقار علی بھٹو جیسے ہیرو کی تلاش ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی ولادت کے وقت سندھ بمبئی کا حصہ تھا سندھ ممڈن ایسوی ایشن کے بانی اور صدر کی حیثیت سے سرشاہنواز بھٹو نے 1930ء کے اوائل میں لندن میں منعقدہ گول میز کانفرنس میں سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا کیس پیش کیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں سندھ کو برطانوی ہند کا گیارواں صوبہ تسلیم کیا گیا۔

کابینہ میں شامل اپنے دیگر ساتھیوں کے برعکس ذوالفقار علی بھٹو نے ریگزار وقت پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ بطور وزیر خارجہ دو ماہ کے بعد ہی انھوں نے 2 مارچ 1963ء کو پاک چین سرحدی معاہدہ کیا جس کی بدولت پاکستان کو 750 مربع میل کا علاقہ حاصل ہوا جو چین کی زیر نگین تھا۔ ان کی ذہنی استعداد نہایت منفرد تھی جب ذوالفقار علی بھٹو کی امریکا کے صدر جان ایف کینیڈی سے وائٹ ہاؤس میں ملاقات ہوئی۔ کینڈی ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا، اس نے بھٹو سے کہا ''اگر آپ امریکی ہوتے تو میری کابینہ میں شامل

www.bhutto.org

ہوتے، بھٹو نے برجستہ جواب دیا ''اگر میں امریکی ہوتا تو میں آپ کی جگہ پر ہوتا'' کینیڈی نے بھٹو کے جواب پر زور دار قہقہہ لگایا۔ 1963ء سے 1970ء کے سال پاکستان میں بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کی رحلت کے بعد دوسرے کرشماتی شخصیت کے حامل رہنما ذوالفقار علی بھٹو کے ظہور کا عرصہ ہے بھٹو کے ظہور کا عرصہ سے بھٹو جناح کے سیاسی وارث تھے۔ جناح نے کشمیر کو بھارتی قبضہ سے نجات دلانے کی انتھک کوشش کی لیکن ان تمام کوششوں پر انگریز کمانڈر انچیف جنرل گریسی نے پانی پھیر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو اسی طرح کشمیر کے معاملے پر ڈٹے رہے اور ایوب کی کابینہ سے اس وقت استعفیٰ دے دیا جب ایوب خان سے 1965ء کی جنگ کے بعد معاہدہ تاشقند پر لال بہادر شاستری کے ساتھ مل کر دستخط کیے جس میں کشمیریوں کے بنیادی حق، حق رائے دہی کو خارج کر دیا گیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کی تشکیل

ایوب خان کی کابینہ چھوڑنے سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو نے 16 مارچ 1966ء میں قومی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا ''پاکستان ایک عظیم نظریہ ہے پاکستان کسی انسان کا بنایا ہوا ملک نہیں ہے۔ یہ خدا کا بنایا ہوا ملک ہے یہ ایک خوبصورت خیال ہے یہ شاہکار کی تخلیق ہے۔ صرف سندھ کے ریگزاروں یا بلوچستان کے سنگلاخ پہاڑوں یا پنجاب کے میدانوں یا غیور پٹھانوں کی سرزمین ہی نہیں۔ یہ اللہ کا بے انتہا کرم ہے یہ تاریخ کے قلب سے باہر آنے والا ایک انقلاب ہے۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے اپنے چار بنیادی اصولوں سے کبھی انحراف نہیں کیا جو یہ ہیں: اسلام ہمارا دین، جمہوریت ہماری سیاست، سوشلزم ہماری معیشت اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان میں سیاست کی لغت کو تبدیل کر دیا۔ انھوں نے اس نو تشکیل شدہ جماعت کے ذریعے جرأت و بہادری اور نئے حوصلہ کا پیغام دیا وہ سیاست کو ڈرائنگ روم سے نکال کر کھیتوں اور فیکٹریوں میں لے آئے جہاں کسان اور مزدور تھے۔ انھوں نے طالب علموں اور دانشوروں کے ساتھ کام کیا۔ پارٹی کی اقتدار کی جدوجہد کے لیے ان کی تقاریر سیاسی افق پر روشنی کی ایک کرن تھیں۔ اسلامی سوشلزم پی پی پی کا پیغام تھا۔

www.bhutto.org

پارٹی کا پرچم تین رنگوں پر مبنی ہے جس میں سبز اور کالا رنگ اسلام اور سرخ رنگ سوشلزم کی ترجمانی کرتا ہے۔

روٹی کپڑا مکان پی پی پی کا نشان بن گئے۔ ملک بھر میں برپا ہونے والی بے چینی نے ایوب خان کو اقتدار سے باہر لا پھینکا اور ان کی جگہ جنرل یحییٰ خان نے اقتدار سنبھالا اور لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت 1970ء میں پہلے عام انتخابات منعقد ہوئے۔

ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کا یکجا ہونا

پاکستان پیپلز پارٹی کو مغربی پاکستان میں کلی اکثریت حاصل ہوئی 20 دسمبر 1970ء کو انتقال اقتدار کے موقع پر ذوالفقار علی بھٹو نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ہمیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جمع کر کے ایک نیا پاکستان بنانا ہے ایک خوشحال اور ترقی پسند پاکستان، ایسا پاکستان جو استحصال سے پاک ہو ایسا پاکستان جس کا تصور قائداعظمؒ نے دیا تھا۔

پاکستان نے 1971ء کی جنگ میں اپنا علاقہ گنوا دیا تھا۔ بھارت نے 90 ہزار جنگی قیدیوں کو بھارتی کیمپوں میں مقید رکھا ہوا تھا۔ یحییٰ خان کی بدکاریوں اور 1971ء کی شکست کا سارا احوال سابق چیف جسٹس آف پاکستان جسٹس حمود الرحمٰن کی سربراہی میں قائم کیے گئے کمیشن کی رپورٹ میں درج ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کا علاقہ اور جنگی قیدی کشمیر پر اپنے موقف سے ہٹے بغیر واپس لیے۔ 2 جولائی 1972ء کو طے پانے والا شملہ معاہدہ وقت کا امتحان تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب بے نظیر بھٹو جو کہ اس وقت تک انڈر گریجویٹ طالبہ تھیں عالمی مظر نامہ پر ایک بین الاقوامی شخصیت کے طور پر سامنے آئیں۔ ذوالفقار علی بھٹو اس وقت اپنی تیاریوں میں بہت محتاط تھے انھوں نے بے نظیر بھٹو کو ہدایات دیں ''تمہیں مسکرانا نہیں ہے اور یہ تاثر دینا ہے کہ تم محظوظ ہو رہی ہو..... تمہیں پریشان نظر نہیں آنا مبادا کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ تم اداس ہو۔''

ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے لیے مستقل وفاقی جمہوری آئین بنانے کا تہیہ کیا۔ ماضی میں بنیادی ایشوز نظر انداز ہوئے تھے جن میں اسلام میں ریاست کا کردار، صوبائی خود مختاری اور صدر اور وزیراعظم کے اختیارات تھے۔

www.bhutto.org

ذوالفقار علی بھٹو نے تن تنہا انتہاؤں پر مبنی متضاد مطالبوں کو یکجا کیا اور ایک متفقہ آئین پر اتفاق رائے پیدا کیا۔ طویل عرصے پر محیط دو فوجی آمریتوں کے لیے یہ بات ممکن نہ ہو سکی کہ وہ 14 اگست 1973ء کو بننے والے اس آئین کو ختم کر سکیں۔

اسلامی سربراہی کانفرنس

تاریخ کے وہ بہترین لمحات تھے جب 38 ملکوں کے سربراہان 1975ء کے بہار کے موسم میں لاہور میں اکٹھے ہوئے کانفرنس کے دونوں چیئرمین شاہ فیصل اور میزبان ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی جانیں مسلم دنیا کے اتحاد کو قائم کرنے میں قربان کیں۔ کانفرنس میں اپنی تقریر میں انھوں نے کہا ''اب تیسری دنیا امیر ملکوں کے شانہ بشانہ اقتصادی معاملات میں شرکت کر سکتی ہے۔'' تیسری دنیا اور عالم اسلام دونوں کو اب ذوالفقار علی بھٹو جیسا ترجمان مل گیا تھا۔

پاکستان کا تحفظ

کوئی مضمون بھی اس ذکر کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جو انھوں نے پاکستان کو ایک مضبوط تحفظ دینے کے لیے کیا۔ ایمبسڈر رابی روڈ نے 1976ء میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام میں گہری دلچسپی لی جبکہ کیسنجر نے دھمکی دی کہ وزیراعظم پاکستان کو اس کی بھاری قیمت چکانا پڑے گی۔ 7 مارچ 1977ء کو عام انتخابات کے سلسلے میں قومی اسمبلی کے انتخابات ہوئے پی پی پی نے اپنی گذشتہ اعلیٰ کارکردگی اور مقبولیت کی وجہ سے 75% نشستیں 65% ووٹ کے ساتھ حاصل کیں جبکہ اپوزیشن کو 200 کے ایوان میں سے 35 نشستیں ملیں اپوزیشن PNA نے حکومت کے خلاف ایک تحریک شروع کی احتجاج کو گلیوں میں پھیلایا گیا۔ آخر کار 2 جولائی 1977ء کو پی پی پی اور پی این اے کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا جس کے تحت تمام پارٹیوں پر مبنی حکومت تشکیل پانا تھی اور نئے انتخابات ہونا تھے۔ 5 جولائی 1977ء کو مارشل لاء لگنے کے بعد پاکستان خوف و دہشت کی ایک سیاہ رات میں داخل ہو گیا۔ ضیاء نے بھٹو خاندان کے اس مفروضہ کے تحت جان بخشی کر دی کہ اب پیپلز پارٹی اپنی مقبولیت کھو چکی ہے یہ مفروضہ اس وقت باطل ہو گیا جب لاہور کی عوام نے 19 راگست 1977ء کو ذوالفقار علی بھٹو کا نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ اس بات کی وجہ

www.bhutto.org

سے ضیاء نوے دن کے اندر انتخابات کروانے کے وعدہ سے مکر گیا اور ایک غلط الزام کے تحت بھٹو کو قتل کروانے کے درپے ہوگیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ سپریم کورٹ کے 9 میں سے 5 جج اس بات کے حق میں تھے کہ بھٹو بے گناہ ہیں لیکن دو ججوں جسٹس قیصر خان اور جسٹس وحید الدین کو ریٹائر کر دیا گیا۔ موت کا سامنا کرتے ہوئے سپریم کورٹ آف پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان کے عوام سے الوداعی خطاب کیا۔ 4/اپریل 1979ء پاکستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دن تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے سہالہ میں بیگم نصرت بھٹو اور اپنی بیٹی بے نظیر بھٹو سے الوداعی ملاقات کی۔ ذوالفقار علی بھٹو کا ورثہ یہ ہے کہ انھوں نے آزادی کی خاطر اپنا لہو بہایا اور شہادت کا رتبہ حاصل کیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کو اس بات کا کریڈٹ جاتا ہے کہ وہ تیس سالوں سے اپنے والد کی طرح آلام برداشت کر رہی ہیں جیسے کہ حضرت زینب نے کربلا کے بعد کیے تھے۔

www.bhutto.org

بھٹو ہر دلعزیز رہنما

عظیم رہنما ذوالفقار علی بھٹو (5/جنوری 1928ء تا 4/اپریل 1979ء) پاکستان کے سیاسی افق پر برق رفتار شہاب ثاقب کی طرح نمودار ہوئے جس کی چمک تا ابد قائم رہے گی۔ وہ واحد سیاست دان سربراہ اور معمر اقوام ہیں جنہیں قدرت نے بے مثال اور بے شمار خوبیوں سے نوازا تھا۔ بلاشبہ وہ پاکستان کے واحد مقبول ترین منتخب وزیراعظم تھے۔ وہ واحد انسان تھے جو اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر آسمان کی رفعتوں تک پہنچے اور جنھوں نے پسماندہ عوام کی تاریکی دنیا کو ایک جگمگاتے ہوئے ستارے کی طرح روشن کر دیا۔

پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو کے عدالتی قتل سے لے کر اب تک عوام اور اسٹیبلشمنٹ کے درمیان کشمکش جاری ہے وہ عوام کو طاقت ور بنانے کے لیے کوشاں تھے انھیں سازشی انتشار، نسلی اور مذہبی تقسیم جو اسٹیبلشمنٹ کے لڑاؤ اور حکومت کرو کے کردار و اسٹیٹس کی پالیسی سے انھیں بچانے کی جدوجہد کے لیے کھڑے ہوئے۔

یہ وہ وقت تھا جب دل برداشتہ عوام کو بے یقینی کے سمندر میں دھکیل دیا گیا تھا ڈھاکہ میں جرنیلوں کے ہاتھوں المناک شکست اور نوے ہزار فوجیوں کی بھارت کے ہاتھوں گرفتاری بہت بڑا سانحہ تھا شہید بھٹو نے اپنے لیے ایک ہدف رکھا کہ انھیں بچے کھچے پاکستان کو گرنے سے بچانا ہے۔ انھوں نے ملک کے باقی ماندہ چاروں صوبوں کی سیاسی قیادت کو ہم آہنگ کیا اور ایک نیا پاکستان تخلیق کر کے زبردست کارنامہ انجام دیا۔

غاصب جرنیلوں کے متعدد غیر آئینی مداخلت کے باوجود بھی یہ 1973ء کا آئین ہی ہے جس نے آج بھی چاروں صوبوں کو ایک بندھن میں باندھا ہوا ہے۔

پاکستان جوں جوں اپنے وجود میں آنے کے ساٹھویں سالہ تکمیل کی جانب بڑھ

www.bhutto.org

رہا ہے اس کا مستقبل میں قائم رہ جانا غیر یقینی صورت حال کے گہرے بادلوں کی چادر میں لپیٹا ہوا نظر آ رہا ہے۔ پاکستان سے کہہ دیا گیا ہے کہ اس نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے حوالے سے جو خدمات انجام دیں ہیں وہ اسے حاصل ہونے والے امریکی ڈالروں اور ہتھیاروں کے ہم وزن نہیں ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستانی فوج ناگزیر ہے لیکن دہشت گردی کے مسئلہ کے ایک جزو کے طور پر سارے مشکوک کردار کو آخر کار ایک نہ ایک دن ختم ہونا لازمی ہے اور یہ اس کے ماہرین کی سوچ کے مطابق ایک ایسی اصلی اور زبردست جمہوری حکومت کے قیام کے ذریعے ہی ممکن ہوسکتا ہے جو نہ صرف مکمل صوبائی خودمختاری بلکہ اسٹیبلشمنٹ پر ایک مضبوط گرفت کی ضمانت بھی دے سکتی ہے۔

پاکستان کے مغربی حامیوں کو بھارت کی تیز تر معاشی ترقی سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ بھارت کی معاشی ترقی کا سہرا اس کے جمہوری نظام، قانون کی حکمرانی، آزاد عدلیہ، شفاف انتخابی نظام اور فوجی اداروں کے سر بندھتا ہے۔ اس ہدف کے حصول کے لیے لازمی ہے کہ پاکستان میں تشدد کرنے والوں کی بیخ کنی کی جائے اور خاص جمہوریت کی بحالی کی راہ ہموار کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ اس طرح کی تذبذب کی کیفیت سے کس طرح نکلا جائے؟ سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو ہی اس گتھی کو سلجھانے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ لندن ٹائمز کے فارن ایڈیٹر براونین میڈاکس کا کہنا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو سب سے بڑی دو سیاسی جماعتوں میں سے ایک کی سربراہ ہیں جن سے انتخابات میں بہتر کارکردگی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس جماعت کا ایجنڈا سیکولر بھی ہے اور آزادانہ بھی۔ آنے والے انتخابات نے اب ''عسکریت پسندوں اور آزاد سوچ رکھنے والوں میں صرف ایک ہی کے لیے گنجائش باقی چھوڑی ہے'' رہی بات اس حکمران ٹولے کی تو اس کے پاس اقتدار عوامی نمائندوں کے حوالے کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں ہے۔

میڈاکس کے علاوہ جنوبی ایشیاء کی سیاست کے دیگر ماہرین بھی امریکی نکتہ نظر کی حمایت کرتے ہیں اور اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ گذشتہ سال لندن اکانوست کے جیمس ایسٹل نے محترمہ کے بارے میں بالکل بجا طور پر کہا تھا کہ صرف وہی ایک واحد قومی

www.bhutto.org

قائد ہیں جو پاکستانی عوام کو اپنے جھنڈے تلے جمع کر سکتی ہیں۔ چوں کہ آج پاکستان کو 1971ء سے بھی زیادہ بدترین حالات کا سامنا ہے لہٰذا اسے ایک بھٹو کی ضرورت ہے جو اسے تباہی کے کنارے سے ہٹا سکے۔

قومی اتفاق رائے سے ایک ایسی حکومت کا قیام ضروری ہے جو عوام کے اعتماد پر پوری اترنے والی مضبوط قیادت میں ملک کو فوج کے ہاتھوں ہونے والی بھیانک ناکامیوں سے بچا سکے۔

www.bhutto.org

شہید ذوالفقار علی بھٹو سنچورین لیڈر

سنچورین کا ماخذ لاطینی زبان کا لفظ، 'سنچ ریو'، یا یونانی زبان کا لفظ، 'ہیکاٹون ٹارکوز' ہے۔ سینچورین رومن آرمی کے اس افسر کو کہتے تھے جو 100 جنگوؤں کا کمانڈر ہوتا تھا وہ تقریباً دو عشروں پر محیط عرصے میں عہدوں کے ذریعے سامنے آتا۔ عہدہ کسی سیاسی عنایت کے ذریعے حاصل نہیں ہوسکتا تھا اسے حاصل کرنے کے لیے اپنی جان کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ سنچورین اپنے جوانوں کے لیے مثال تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے دستوں کی رہنمائی کرتا تھا۔ اس سے منصوب دو نشان تصدیق تھے ایک شجاعت اور دوسرا وقار۔ سنچورین بننے کے لیے جرأت مند دل، سیمابی روح، فطین دماغ اور بصارت پر مبنی روح کی ضرورت ہوتی ہے۔ سنچورین تک پہنچنے والے کو سمجھا جاتا تھا کہ اس نے اعلیٰ ترین عزت و اکرام کے درجے کو حاصل کرلیا ہے۔

سنچورین رہنما میں تخلیقی صلاحیت، اتحاد یقین، متحرک، استقامت، دلیری اور عوام کے ساتھ لگن اس کا طرہ امتیاز ہے۔ ماضی میں ایسے بہت سے سنچورین لیڈر گزرے ہیں جن میں مذکورہ خوبیوں میں سے ایک یا ایک سے زیادہ موجود تھیں۔ ان میں سکندر اعظم، ہنی بل، جارج واشنگٹن، ابراہیم لنکن، مائوے تنگ، نپولین، کمال اتاترک شامل ہیں۔ لیکن وہ رہنما جو ان تمام سے منفرد ہے وہ شہید ذوالفقار علی بھٹو ہے عوام کا آدمی جس میں سنچورین رہنما کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔

شہید بھٹو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور وسیع المطالعہ انسان تھے۔ ان میں متحد کرنے کی زبردست صلاحیت موجود تھی وہ ایک سوشل ڈیموکریٹ تھے۔ انہوں نے عوام کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان کا تخلیقی نعرہ لاکھوں افراد کو دیا جو ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ انھوں نے ٹوٹے

ہوئے ملک کو متحد کیا اور 90 ہزار قیدیوں کو پاکستان کا ایک انچ دیے بغیر اور کشمیر پر اپنے موقف سے ہٹے بغیر واپس لائے۔ انھوں نے مسلم دنیا کو اس کے اسلامی ورثہ جو محبت، امن اور اخوت پر مبنی ہے اکٹھا کیا۔ انھوں نے عوام کو نیا سماجی نظام دیا، ملک کی اقتصادی ترقی کی اور خارجہ پالیسی کو نئے خطوط پر استوار کیا، انھوں نے عوام کو حق رائے دہی اور متفقہ آئین دیا۔ وہ سرد جنگ کے دور میں پاک چین دوستی کے بانی ہیں اور ان کے دور میں مغرب کے ساتھ تعلقات مزید مضبوط ہوئے۔ ان کے دور میں پاکستان میں ٹھوس معاشی ترقی اور ایٹمی پروگرام میں بہت بڑی پیش رفت ہوئی۔ وہ اپنے عوام کو بہت بہتر جانتے تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے اسی لیے انھیں قائد عوام کہا جاتا تھا۔ وہ واضح طور پر ترقی پذیر ممالک کے غیر متنازعہ رہنما تھے۔ انھیں بہت سے مغربی صحافیوں اور رہنماؤں جن میں جان ایف کینیڈی بھی شامل تھے بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ کینیڈی نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اگر بھٹو امریکی ہوتے تو ان کی کابینہ میں شامل ہوتے۔ پاکستان خوش قسمت تھا کہ اس کے پاس پہلا جمہوری طریقے سے منتخب وزیراعظم شہید بھٹو موجود تھا۔ شہید بھٹو 51 سال کی عمر میں ان کے ہاتھوں شہید کر دیے گئے جو پاکستان اور اس کی عوام کو ترقی کی بلندیوں پر دیکھنا برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن 30 سال گزرنے کے باوجود بھی اپنے لاکھوں چاہنے والوں کے درمیان زندہ ہیں۔ آج ان کی بہادر بیٹی محترمہ بے نظیر بھٹو جنہیں مسلم ریاست کی پہلی کم عمر وزیراعظم بننے کا اعزاز حاصل ہوا سچو رین رہنما کی تمام خوبیوں سے مالا مال ہیں انھوں نے پاکستان کے عوام کی عزت و تکریم اور ان کے سماجی اور جمہوری حقوق کی بحالی کا اور اپنے عظیم والد کا مشن جاری رکھا ہوا ہے۔ پاکستان کی عوام کو اپنے تحفظ کے لیے ان کی ضرورت تھی کیوں کہ انھیں معلوم ہے کہ پاکستان کو ناامیدی سے نکال کر اقتصادی خوش حالی کی منزل تک صرف وہی لا سکتی ہیں۔

www.bhutto.org

بھٹو اور حالاتِ حاضرہ

پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی چیئرمین سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کو دنیا سے رخصت ہوئے اٹھائیس برس ہوگئے۔ حسب روایت پیپلز پارٹی والے ان کی برسی ہر سال بڑے جوش سے مناتے ہیں۔ گڑھی خدا بخش لاڑکانہ میں مرحوم کے آبائی قبرستان والے میدان میں اجتماع ہوتا ہے جس میں پاکستان کے ہر حصے اور بیرون ممالک سے بھی آئے ہوئے حضرات شرکت کر رہے ہوتے ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے یوم وفات کی یہ تقریبات معمولی سی تبدیلی کے بعد 4/اپریل کی صبح کو ختم ہوتی ہیں اور جیالوں کی واپسی شروع ہو جاتی ہے، گزشتہ تین چار سال سے برسی کے پروگرام میں موسم کے اعتبار سے کچھ تبدیلی کی گی ہے جس کے مطابق تقریبات کا آغاز 3/اپریل کی شب ہوتا ہے تو نماز فجر تک تسلسل سے جاری رہتا ہے۔ یوں دھوپ کی شدت سے بچنے کے ساتھ ساتھ قافلوں کی دن کے وقت واپسی شروع ہو جاتی ہے۔ رات کو مرحوم بھٹو کی دیہی رہائش گاہ پر مرکزی مجلس عاملہ اور وفاقی کونسل کا مشترکہ اجلاس ہوتا ہے جس کے بعد یہ سب حضرات گڑھی خدا بخش آ جاتے ہیں جہاں پہلے مشعل بردار جلوس اور اس کے بعد مشاعرہ ہوتا ہے۔ برسی کی آخری تقریب جلسہ ہے جس سے قائدین خطاب کرتے ہیں اس دوران مزار پر فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی ہوتی ہے۔ نہ صرف مرحوم بھٹو بلکہ ان کے دونوں صاحبزادوں مرتضیٰ بھٹو اور شاہ نواز بھٹو کے لیے بھی دعائے مغفرت کی جاتی ہے جو یہیں مدفن ہیں۔

کہنے کو تو اٹھائیس برس گزر گئے لیکن حالات کے مطابق کل کی بات نظر آتی ہے اور یوں احساس ہوتا ہے کہ بھٹو کہیں موجود ہیں جو کسی بھی وقت آ سکتے ہیں لیکن یہ دیوانوں کا خواب ہے اب تو بھٹو کی صاحبزادی کا انتظار ہے جو گذشتہ سات سال سے بیرون ملک اپنے بچوں کے ساتھ دوبئی میں مقیم ہیں، اب تو ان کے شوہر بھی کئی سال سے ان کے پاس ہیں اور

www.bhutto.org

نیویارک میں خاموش زندگی بسر کر رہے ہیں کہا جاتا ہے کہ وہ وہاں علاج کی غرض سے مقیم ہیں، بے نظیر بھٹو کے دوبئی میں قیام اور آصف زرداری کا نیویارک میں ہونا کئی بار افواہوں کا باعث بھی بنا جسے چند ماہ قبل مشترکہ پریس کانفرنس کے ذریعے زائل کرنے کی کوشش کی گئی۔

مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کا عروج و زوال رومانوی کیفیت کا حامل ہے اور بسا اوقات ان کی سیاست میں آمد اور عروج الف لیلیٰ کی کوئی کہانی محسوس ہوتی ہے۔ بھٹو ایک زیرک، ذہین اور پر اثر شخصیت کے مالک سیاست دان تھے جو حمایت اور خالفت کے بڑے طوفانوں سے گزرے اور بالآخر اپنی خواہش کے مطابق تاریخ کا ایک حصہ بن کر زندہ ہیں۔ بھٹو نے جس دور میں مرحوم ایوب خان سے علیحدگی اختیار کی وہ بھی بحالی جمہوریت ہی کی جدوجہد کا دور تھا جس میں انھوں نے حصہ ڈالا، تاہم ان کے نصیب میں اقتدار نصف سے بھی کم پاکستان کا لکھا تھا، کرسی اقتدار پر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے براجمان ہونے والے بھٹو کا سب سے بڑا کارنامہ جہاں پسماندہ طبقات کو اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے کی جرأت دینا ہے وہاں 1973ء کے متفقہ آئین کی تدوین اور منظوری بھی انہی کے کریڈٹ میں جاتی ہے کہ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ملک سے مارشل لاء ہی ختم نہیں کیا اسے ایک ایسا آئین بھی دیا جسے اتفاق رائے کا آئین کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ انھوں نے امتناع قادیانیت کا قانون بھی منظور کرایا، قادیانیوں کو انہی کے دور میں اقلیت قرار دیا گیا، اس کے علاوہ بھی ان کے حصے میں کئی کارنامے آتے ہیں اور آج بھی ان کی جماعت نہ صرف موجود ہے، بلکہ ان کی صاحبزادی دو مرتبہ وزیراعظم بھی رہ چکی ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کو یاد کرتے ہوئے ان حالات میں آئے اور ملک کے دولخت ہونے کے بعد بھی پیش آئے اور پھر خود ان کے خلاف تحریک بنی اور وہ تختہ دار تک پہنچے۔ ماضی کا آئینہ دیکھتے ہوئے آج کے حالات پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ احساس ہوتا ہے کہ زمانہ جیسے ٹھہر سا گیا ہے۔ پاکستان میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی، کل بھی یہاں جاگیردار اور سرمایہ دار اسٹیبلشمنٹ کی بیساکھیوں کے سہارے حکمران تھے تو آج بھی ہیں۔ بھٹو کے ایک مختصر سے دور کے علاوہ ایسا وقت کوئی بھی نہیں جب ان بیساکھیوں کے بغیر کوئی حکومت چلی ہو، پاکستان کی مسلح افواج کے سربراہ حضرات کا جو دخل مرحوم ایوب خان کی ذات سے شروع ہوا وہ آج بھی جاری و ساری ہے، شخصیات اور شکلیں تبدیل ہو چکی ہیں حالات میں کوئی تبدیلی نہیں

www.bhutto.org

آئی۔ آج بھی سیاسی جماعتیں جمہوریت مانگ رہی ہیں، کل بھی یہی مطالبہ کیا جاتا تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے چیئرمین بھٹو کی قیادت میں نظام کی تبدیلی کا نعرہ لگایا تھا، یہ مضبوط ترین استحصالی نظام تو تبدیل نہ ہوسکا۔ پیپلز پارٹی کے نظریات میں دور جدید کی ضروریات کے نام پر تبدیلی آ گئی۔ کہاں وہ دور کہ متعدد اہم صنعتیں اور تعلیمی ادارے قومی ملکیت میں لے لیے گئے اور کہاں یہ دور کہ اب پیپلز پارٹی نجی ملکیت کی حامی بن گئی ہے۔ بہر حال آج بھی بے شمار لوگ جن میں دانشوروں کا بڑا طبقہ بھی ہے یہ سمجھتے ہیں کہ پیپلز پارٹی ایک روشن خیال جماعت ہے جس میں ہر نظریے کے لوگوں کو سمونے کی اہلیت ہے۔ بہر حال ذکر تو حالات کا تھا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک کے نصیبوں اور عوام کی قسمت میں چین لکھا ہی نہیں ہوا، غریب آج بھی غریب تر اور امیر امیر تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ ''چور اچکا چودھری تے غنڈی رن پردھان'' کی طرح آج بھی مظلوم کی فریاد ظالم کے اثر اور رسوخ کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔ استحصالی نظام نے سماج کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ لوگ نہ صرف روزگار، صحت اور تعلیم جیسی سہولتوں سے محروم ہیں، بلکہ ان کو انصاف بھی نہیں ملتا، مہنگائی کا یہ عالم ہے کہ پھل ڈاکٹر کے نسخے پر بھی دوا کے طور پر ہی کھایا جاسکتا ہے ورنہ عام شہری کی استطاعت سے باہر ہو چکا ہے۔ اسی طرح دوسری اشیاء خوردنی بھی پہنچ سے باہر ہیں، سفید پوش طبقہ پس کر رہ گیا ہے۔ بعض دانشوروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ حالات کسی بھی عوامی انقلاب کے لیے سازگار ہیں صرف قیادت کی ضرورت ہے لیکن یہاں بھٹو کی صاحبزادی ہوتے ہوئے بھی بھٹو نہیں ہیں۔ سیاسی جماعتوں کا نعرہ جمہوریت تو ہے لیکن مہنگائی اور بے روزگاری پر زور نہیں دیا جاتا، آج بھی سابقہ ادوار کی طرح حزب اختلاف کی جماعتوں کے متحدہ محاذ کی بات کی جارہی ہے اور ہر مرض کا علاج جمہوریت ہی کو قرار دیا جارہا ہے، تاہم حقیقی عوامی مسائل کا ذکر سرسری ہوتا ہے۔ ایسے میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی برسی کے موقع پر پیپلز پارٹی سے یہ توقع بے جا تو نہیں کہ وہ واپس اپنے 1970ء والے منشور کی طرف لوٹے ہیں۔ جماعت کو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور مفاد پرستوں سے بچایا جائے گا اور عوامی مفاد کے لیے جدوجہد کی جائے گی۔ ورنہ وکلاء تو انصاف کے لیے تحریک جاری رکھے ہوئے ہیں اور اس امکان کو خارج نہیں کیا جاسکتا کہ مستقبل میں یہی وکلاء قوم کی رہنمائی کا فریضہ ادا کرتے نظر آئیں۔

www.bhutto.org

بھٹو کل بھی زندہ تھا آج بھی زندہ ہے

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پاکستان پیپلز پارٹی اور مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کا ذکر اس حوالے سے ہمیشہ سنہری حروف میں کیا جائے گا کہ پی پی پی وہ پہلی سیاسی جماعت ہے کہ جس نے انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل ہونے کے بعد جب اپنی حکومت قائم کی تو یہ پہلی منتخب اور آئینی حکومت تھی جسے اپنے آئینی مدت اقتدار پوری کرنے کا موقع ملا اگر اس وقت کی 9 اپوزیشن جماعتیں حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے بیرونی اشاروں پر تحریک چلانے سے گریز کرتیں تو معاملہ افہام تفہیم سے حل ہوسکتا تھا اور مہم جو عناصر کو ملک میں طویل ترین مارشل لاء نافذ کرنے کا بھی موقع نہ ملتا، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا اور اپوزیشن جماعتوں نے بھی حقیقت کا ادراک نہ کیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی آج بھی ملک کی مقبول ترین سیاسی قوت ہے اور اگرچہ اس کی قیادت جلاوطنی پر مجبور ہے، لیکن پارٹی کی کارکنوں کے دل ان کے ساتھ دھڑکتے ہیں اور قیادت کی جلاوطنی بھی پارٹی کی سیاسی مقبولیت میں کمی نہیں کرسکی، اس کا ثبوت یہ ہے کہ گذشتہ انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں حکومتی مداخلت اور پابندیوں کے باوجود کامیابی حاصل کی اور یہ کامیابی اس حد تک موثر اور قابل ذکر تھی کہ حکمرانوں کو حکومت قائم کرنے میں سخت ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور اس مقصد کے لیے انھوں نے پی پی پی کے بعض مفاد پرست ارکان سے جنھوں نے پارٹی ٹکٹ پر کامیابی حاصل کی تھی عہدوں کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملایا۔ یہی رویہ بعض دوسری سیاسی جماعت کے منتخب ارکان کے ساتھ اختیار کیا گیا تاکہ ایک کھچڑی پکائی جاسکے او راس طرح مختلف سیاسی جماعتوں کے مفاد پرست ارکان کو سیاسی وفاداریاں بدلنے پر تیار کرنے کے بعد

www.bhutto.org

حکمران ایک مخلوط حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے، لیکن اب ان مفاد پرست عناصر پر پیپلز پارٹی کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں۔

اب ذرا ماضی کی طرف چلیے اور دیکھئے کہ بھٹو مرحوم نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد ایوب حکومت کے معاہدہ تاشقند پر اختلافات کی وجہ سے علیحدہ ہونے کے بعد رکھی، وزیر خارجہ کی حیثیت سے انھوں نے قومی مفادات کا اس شاندار طریقے سے تحفظ کیا عالمی اور علاقائی مسائل پر ایسی دور اندیشی اور سیاسی بصیرت کا ثبوت دیا کہ مختصر عرصے میں وہ ملک کے ایک نامور سیاستدان بن گئے اور انھیں عالمی شہرت بھی حاصل تھی۔ وہ عوامی مفادات کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے اور ان کے جذبے نے انھیں صحیح معنو میں ایک عوامی رہنما بنا دیا تھا، چنانچہ جب انھوں نے لاہور میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی اور اپنے منشور میں روٹی کپڑا اور مکان کو سرفہرست رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے تمام مخالف سیاسی جماعتوں کی مقبولیت اور اکثریت ختم ہوگئی اور پیپلز پارٹی ملک کی سب سے مقبول عوامی سیاسی جماعت کی حیثیت سے سامنے آئی، چنانچہ جنرل یحیٰی خان کے دور میں ہونے والے انتخابات میں پی پی پی نے زبردست اکثریت حاصل کی۔ لوگ یہ کہتے سنے گئے کہ اگر بھٹو کسی بجلی کے کھمبے کو بھی پارٹی کا ٹکٹ دے دیں تو وہ بڑے سے بڑے سیاست دان کا تختہ الٹ سکتا ہے چنانچہ پیپلز پارٹی کے معمولی کارکنوں کے مقابلے میں کئی سیاسی اجارہ دار بری طرح شکست سے دو چار ہوئے۔ یحیٰی خان کی غلطی کے نتیجے میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد پیپلز پارٹی کو موجودہ پاکستان کا اقتدار سونپ دیا گیا اور بھٹو مرحوم وزیراعظم کے منصب پر فائز ہوئے۔ بھٹو مرحوم نے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد اپنے انتخابی منشور کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا انھوں نے غریب عوام کی مشکلات کا ازالہ کرنے کی پالیسی اختیار کی دولت کا ارتکاز اور چند ہاتھوں میں قومی وسائل کو جمع ہونے سے روکنے کے لیے انھوں نے بعض صنعتوں، بنکوں اور دوسرے اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا۔ انھوں نے معیار تعلیم بلند کرنے اور اساتذہ کی محرومیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے نجی تعلیمی اداروں کو بھی قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کیا اس طرح ان اداروں میں جہاں ملازمت کے نئے مواقع پیدا ہوئے، بے روزگاری میں کمی آئی، وہاں دولت چند خاندانوں میں سمٹنے سے بچ گئی اور معاشرے میں مساوات کے تصور کو تقویت ملی قومیائی گئی صنعتوں میں ہزاروں افراد کو ملازمت فراہم کی گئی۔

www.bhutto.org

بھٹو مرحوم کے اہم ترین کارنامے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینا اور اسلامی جمہوری آئین کی تشکیل تھی، ان کے اقتدار سنبھالنے سے پہلے پاکستان کو سرزمین بے آئین کا نام دیا جاتا تھا اور پچیس سال گزر جانے کے باوجود ملک کا آئین بھی تشکیل نہ پاسکا تھا جو کسی بھی لحاظ سے قومی وقار سے مطابقت نہیں رکھتا تھا بھٹو مرحوم نے قرارداد پاکستان کی روشنی میں اسلامی اور جمہوری آئین کی تشکیل کی اور یہ آئین قومی اسمبلی کے تمام ارکان کی طرف سے مکمل اتفاق رائے سے منظور کیا گیا یہی وجہ ہے کہ آج ہر سیاسی جماعت حکومت سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ وہ 1973ء کا اسلامی اور جمہوری آئین بحال کرے۔

بھٹو مرحوم نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ایک عظیم کارنامہ انجام دیا کسی مذہبی جماعت اور حکومت کو یہ توفیق نہ ہوئی تھی کہ وہ ختم نبوت کا انکار کرنے والوں کو غیر مسلم قرار دے۔ یہ اعزاز بھٹو مرحوم کو حاصل ہوا اور ان کی بخشش کے لیے یقیناً ان کا یہ اقدام بارگاہ ایزدی میں قدر و منزلت کا باعث ہوگا۔ انھوں نے ملک بھر کے غریب اور بے گھر خاندانوں کو سر چھپانے کے لیے جگہ دینے کی خاطر کچی آبادیوں کے مکینوں کو حقوق ملکیت دینے کا پروگرام شروع کیا اس طرح ملک کے لاکھوں بے گھر خاندان اپنے لیے مکان بنانے اور سر چھپانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس طرح انھیں زندگی کی ایک ایسی بنیادی سہولت میسر آئی جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ قومی اور ملکی سلامتی اور دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے انھوں نے ایٹمی پروگرام کی بنیاد رکھی اس مقصد کے لیے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ہالینڈ سے پاکستان بلایا اور انھیں ایٹمی پروگرام کا انچارج مقرر کیا امر واقعہ یہ ہے کہ یہ پروگرام بھٹو نے ہی شروع کیا اور اس کی تکمیل اور آج پاکستان کے ایٹمی قوت ہونے کا کریڈٹ بھی بانی کی حیثیت میں بھٹو مرحوم ہی کو جاتا ہے۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ پاکستان کی سٹیل ملز کا قیام تھا یہ منصوبہ اس وقت روس کے صنعتی اداروں کے تعاون سے شروع کیا گیا جب پوری دنیا کمیونسٹ بلاک اور سرمایہ دار بلاک میں بٹی ہوئی تھی روس کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کو خوشگوار بنانے اور روسی سفیر پر اعتماد کی فضا پیدا کرنے میں بھٹو مرحوم نے بنیادی کردار ادا کیا اس وقت کوئی یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ کمیونسٹ بلاک کا سربراہِ ملک پاکستان میں ایک اہم ترین دفاعی منصوبے میں فنی اور مالی تعاون فراہم کرسکتا ہے لیکن بھٹو مرحوم کی سیاسی بصیرت اور دور اندیشی نے یہ ممکن کر

www.bhutto.org

دکھایا۔

پاکستان کی تعمیر و ترقی اور خاص طور پر ایٹمی پروگرام بعض عالمی طاقتوں کی نگاہ میں کھٹک رہا تھا، چنانچہ اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کے بھٹو مرحوم کو اس پروگرام کے حوالے سے نمونہ عبرت بنانے کی جو دھمکی دی تھی وہ ضیاء الحق کے ہاتھوں مارشل لاء کے نفاذ اور بھٹو کو شہید کرنے کی صورت میں پوری ہوئی، لیکن بھٹو آج پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک سنہری باب ہے اور قوم اس کے احسانات کبھی نہیں اتار سکے گی وہ کل بھی زندہ تھا آج بھی زندہ ہے۔

www.bhutto.org

ضیا کے پہلے قیدی.....بھٹو

وہ ظالم میرے بچپن کی محبت تھا۔ وہ بھٹو تھا۔ میں نے بچپن میں جب ہوش سنبھالا تو اپنے شہر میں اپنے گردنئی ''پی پل پارٹی'' کے ترنگے پرچم، سائن بورڈ، بینر، ملے، جلسے، جلوس دیکھے اور جیوے بھٹو جیسے نعرے سنے۔ تب میری عمر نو اور ''پی پل پارٹی'' کی تین سال تھی۔ یہ تمام باتیں ہمارے بہت اچھے دوست جن کے پاس میں بیٹھا تھا سنا رہے تھے میں انکا نام لکھنا نہیں چاہتا وہ باتیں سنائے جارہے تھے، اور میں غور سے سنے جارہا تھا وہ فوراً تھوڑا سا رُک کر پھر بولے!

یہ وہ دن تھے جب میرے ہم جولی، سنگی ساتھی میرے گھر والی گلی میں کنچے، گلی ڈنڈا اور ''پٹھو گرم'' کھیلتے پورا محلہ سر پر اٹھائے رکھتے اور میں گھر کی اوپری منزل جسے میری بالائی سندھ میں بولی جانے والی سندھی میں کوٹھا، کہتے ہیں، کی کھلی کھڑکی سے گلی میں کھیلتے بچوں کی باتوں اور گالیوں، قریب میں پڑوس والے گھر میں ساس بہو کے مہابھارت قسم کے جھگڑوں، گلی میں گزرتے باتیں کرتے ہوئے جاتے مردوں اور عورتوں کی باتوں کو غور سے سنا گیا اور ان کی حرکات وسکنات کو گھنٹوں نوٹ کرتے رہتا۔

یہی میرے بچپن کے کھیل تھے۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اسی گلی سے جلوس گزرنے لگا جسے ہم ''جلسہ'' کہتے تھے۔ لوگ ''پیپلز پارٹی'' کے ترنگے اٹھائے جیوے بھٹو کے نعرے لگاتے اور ان نعروں پر تالیوں کی تال پر سندھی جھمر (رقص) کرتے جارہے ہیں۔

''قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد''، ''فخر ایشیا زندہ باد''، ''جیوے جیوے کھیر پیوے'' جیسے نعرے۔ میں بھی وہاں سے جاتے اس ہجوم کے پیچھے ہولیا۔ اس سے پہلے بھی بچے اور لوگ تب کسی کے پیچھے لگ جاتے تھے جب پولیس والے کسی شخص کو پکڑ کر تھانے

لیے جاتے (ہم بچے ہر پکڑے جانے والے شخص کو ''چور'' کہا کرتے) یا پھر کوئی غیر ملکی سیاح اور کبھی کبھی سیاحی وہاں سے گزرتے، ہم ہر غیر ملکی کو انگریز کہتے پھر وہ چاہے کوریائی ہو کہ جاپانی، فوجی اور پولیس والے کو سلام کرتے اور ان سے ہاتھ ملاتے اور اگر کوئی پٹھان یا ہمارا کوئی ٹیچر دور سے آتے دیکھتے تو بھاگ کر چھپ جاتے۔

اس سے پہلے ہم نے وہاں سے صرف چودہ اگست اور تیئس مارچ والے جلسے دیکھے تھے۔ یا پھر ایک اور جلوس جو عجیب اور اچھا تو لگا تھا لیکن انہی پولیس والوں نے ہمیں ڈانٹ کر گھر میں چلے جانے کو کہا تھا جو ہم سے بے تپاک سے ہاتھ ملاتے تھے اور جنھیں ہم وہاں سے گزرتے سلام کیا کرتے تھے۔

یہ جلوس ہائی سکول کے بڑے لڑکوں کا تھا جن سے ہم ہر وقت متاثر ہوا کرتے تھے اور وہ دکانیں بھی بند کرواتے جا رہے تھے اور اس وقت کے صدر ایوب خان کے خلاف نعرے بھی لگاتے جا رہے تھے اور ''ذالفقار علی بھٹو زندہ باد'' بھی کہتے جاتے۔ میں نے اس وقت سمجھا تھا کہ شاید یہ ذوالفقار علی بھٹو ان کے ہیڈ ماسٹر کا نام ہے کیوں کہ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی ''بھٹو صاحب'' کہلاتے تھے لیکن یہ اور بھٹو تھے۔

یہ ''ہائی سکول'' ایک اور نعرہ بھی لگا رہے تھے ''چچہ گیری نہیں چلے گی''

لیکن ہائی سکول کے کافی دنوں بعد یہ جو وہاں سے گزرنے والا نیا ''جلوس'' تھا۔ اس میں سب دیکھے بھالے لوگ تھے جو اب ''جیوے جیوے'' کی تال پر جھمر کرتے اور نعرے لگاتے گزرتے تھے۔ ''کسان کا قائد بھٹو ہے''، ''مزدور کا قائد بھٹو ہے۔''

اس میں ریڈیو ساز باغ علی بھی تھا تو میرا بس کنڈیکٹر سابق فوجی ماموں خادم حسین شہر کا سماجی کارکن اور دو میں سے ایک شعلہ بیان مقرر اور سابق تھیٹر اداکار محمد خان (یہ تھیٹر کا وہ زمانہ تھا جب ہیروئین کا رول لڑکے ادا کیا کرتے۔ اس تھیٹر کے مرحوم اور پردیسی ڈائیریکٹر کی قبر پر ہم نے یہ کتبہ دیکھا، ''جلتے ہیں ارمان میرا دل روتا ہے، قسمت کا دستور نرالا ہوتا ہے)۔''

سائیکلوں کے مستری اعظم اللہ ڈنو، اور قریبی شہر کے بڑے راج مستری جالندھری محمد حسین، سیٹھ فتح محمد سموں اور میرے پہلی جماعت کے اور پسندیدہ استاد عبدالرحمان اس ''جلسے'' میں شامل ہوتے اور کبھی کبھی اس جلسے میں ترنگوں اور بینروں سے سجی پرانی ویلز

www.bhutto.org

جیپ بھی ہوتی۔

یہ جلوس مارکیٹ چوک پر اختتام کو پہنچتا اور میرے لیے زیادہ دلچسپی والی بات اس میں ہونے والی تقریریں اور شعروشاعری ہوتی۔ جب راج مستری لہک لہک کر پڑھتے ''اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو، کاڑ امرا کے درو دیوار ہلا دو، یا پھر شاہ مرداں شیر یزداں'' وغیرہ وغیرہ۔

اچکے، ناچ گانے والے اور مکھن چاہی نئی ''پیپلز پارٹی'' میں جانے لگے ہیں۔ یہ خانہ بدوش (جواب اکثر خانہ بدوش نہیں رہے) مکھن شاہی قبیلہ فقط بالائی سندھ کے گھوٹکی اور اس کی سرحد پر واقع جنوبی پنجاب کے رحیم یار خان اضلاع میں ملیں گے۔ کچھ سخت بھٹو مخالف تو یہ نعرہ بھی لگانے لگے تھے مثلاً یہ کہ ''سو سے زیادہ مولویوں نے فتویٰ دیا ہے کہ بھٹو کافر ہے اور سوشلزم کا مطلب ہے بھائی کی بہن سے شادی، مگر یہ میرے شہر کے ''اوائلی پیپلیے'' سبھی کے۔ٹو کی دین میں مگن، کے مصداق اپنی پارٹی اور بھٹو کے جنون میں رہے۔

مجھے ان کے نعرے ان کا ناچ گانا اور تقریریں اچھی لگیں۔ مجھے جو جیب خرچ ملتا اس سے پی پی پی کے سنہری اور رنگین ''بلے'' خریدتا اور سینے پر لگا کر گھومتا۔ میرا بھی دل کرتا کہ میں بھی سرگرم جیالوں کا حلقہ بگوش ہو جاؤں۔ پھر میں نے ان لوگوں سے ان کے ایک جلسے میں گزارش کی کہ میں بھی شعر پڑھوں گا۔ میں نے تب پی پی پی کے اخبار ''ہلالِ پاکستان'' میں چھپا ہوا پتا نہیں کس کا شعر بڑے جوش وخروش سے پڑھا:

گھوٹ گولین ماں بچایو ملک جے مالک جبار

قوم جو لیڈر سچو آ ہے برابر ذوالفقار

(خدا نے اس دولہے کو گولیوں سے بچایا، قوم کا یہ سچا رہنما ذوالفقار علی ہے)

بس پھر کیا تھا پی پی پی کے ہر جلسے جلوس اور انیس سوستر کے انتخابات کی مہم میں میری تقریروں اور شعر بازی کی مانگ ہونے لگی۔ مجھے میرے بڑے جیالے ''ننھا مجاہد'' کہنے لگے۔ لوگ مجھے راستے میں روک کر بھٹو پر شعر یا تقریر کی فرمائش کرتے۔

اب رمضان کے آخری دن آنے لگے اور میں نے جیب خرچ میں سے پیسے بچا کر بھٹو کو بھیجنے کے لیے عید کارڈ خریدا جس پر تمام اسلامی ملکوں کے جھنڈے تھے۔ یہ میرا آج تک کسی کو بھیجا جانے والا پہلا اور آخری عید کارڈ تھا۔ میں نے پی پی پی کے باغ علی

www.bhutto.org

سے بھٹو کا پتا مانگا۔ ''جناب ذوالفقار علی بھٹو ستر کلفٹن کراچی''، اس نے ایک کاغذ کے پرے پر لکھ کر دیا۔

عید سے ایک دن قبل میں اپنے والد کے ساتھ خیر محمد کی دکان پر بال کٹوانے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ لوگ سر کے بڑے بال رکھنے کو ''بھٹو کٹ'' کہتے۔ خیر محمد کی دکان کی دیواروں پر لگے شیشے کے فریموں میں ایوب خان کی اپنی اہلیہ کے ساتھ تیس مارچ کی تقریب میں بگھی میں سے فوجی پریڈ کی سلامی، اور جنرل موسیٰ خان اور یحییٰ خان کی تصویریں تھیں۔

خیر محمد کی دکان کے باہر سڑک پر سے گاڑی پر بندھے لاؤڈ سپیکر سے اعلان ہو رہا تھا کہ عید کے روز ذوالفقار علی بھٹو شہر میں پرائمری سکول کے سامنے والے میدان میں جلسۂ عام سے خطاب کریں گے۔ یہ میرے شہر کے بہت سے لوگوں کے لیے ''ڈبل عید'' تھی۔ ظاہر ہے مجھے تو نظم پڑھنا یا تقریر کرنا ہی تھی۔

مرحبا صد مرحبا شانِ گلستان ذوالفقار مرحبا.....مجمع

تھا ابھی ذوالفقار علی بھٹو کی آمد کا دور دور تک پتا نہیں تھا پھر جب آدھی رات بھی گزر چکی تو بھٹو کی آمد کا اعلان ہوا۔ وہ واقعی سندھ کا رانو تھا جو نیم شب کا راگ ''رانو'' دن کو سنا کرتا تھا۔

انتہائی خوش شکل اور خوش لباس حسین و جمیل مرد۔ گیسو دراز ذہین و فطین بھٹو۔ یہ ہزاروں لاکھوں لوگ اسے سننے سے زیادہ قریب سے اسے دیکھنے اور چھونے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ بالکل ایسے جیسے وہ کسی غیر ملکی سیاح یا بھولے سے وہاں سے گزرنے والی فلمی ستارے پر رشک کیا کرتے تھے۔ اس دھکم پیل میں بھٹو ناراض ہو کر مائیک چھوڑ کر روانہ ہوئے۔

''عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیراں لرگیا وہ''

پھر اگلے سال اسی دسمبر کی ایک شب میں نے اسے اپنے پڑوسیوں کے ریڈیو پر سنا۔ اب وہ آدھے ملک کا صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریشن تھا اور اپنی قوم سے خطاب میں کہہ رہا تھا:

''یہاں تک کہ میرے بیانات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ مجھ پر

www.bhutto.org

قاتلانہ حملے ہوئے اور اب تک میرے پیٹھ پر پولیس کے لاٹھی چارج
کے نشانات موجود ہیں۔ آئیں اور اب ایک نئے پاکستان کا آغاز
کریں۔ ایک نیا پاکستان، عوام کا پاکستان۔''

لیکن بھٹو سے میری بچپن کی محبت کا خون ہوتا میں نے ''الفتح'' جیسے جریدوں کے سرورس پر لانڈھی اور کورنگی کے مزدوروں کے لہو لہان جسموں اور لاشوں کی تصویروں کی صورت دیکھا جب بھٹو کی حکومت کے چند مہینوں بعد مزدوروں کا قتل اور انھیں جلتی تیل کی کڑھائیوں میں پھینکے جانے کی خبریں آئیں۔ وہ دن اور آج کا دن بھٹو سے میری محبت ہوا ہوئی۔ ساحر کے اس شعر کے ساتھ کہ:

''اے رہبر قوم و ملک بتا یہ کس کا لہو ہے کون مرا''

بھٹو کی پی پی پی کو شہر میں متعارف کروانے والوں میں سے محمد خان بھی پیپلز پارٹی ہی کے ان بہت سے رہنماؤں اور کارکنوں میں سے ایک تھے جو بھٹو حکومت کے زیر عتاب آئے اور قیدی بنے اور پھر پانچ جولائی انیس سو ستتر تک بھٹو کا دور پاکستان میں لاٹھی گولی کے راج کا دور تھا۔ بغیر وردی کے مارشل لاء کا دور۔ ہر کمال کے بعد ایک زوال اور ہر بھٹو کے پیچھے ایک کوثر نیازی (اور ہر پرویز کے پیچھے شیخ رشید!) ہوا کرتا ہے۔

لیکن پانچ جولائی کی شب سے پہلے والے بھٹو اور پانچ جولائی کی شب والے بھٹو میں ''بقول شخصے'' صرف دن رات کا نہیں تاریخ کا فرق تھا۔ اب وہ اور پاکستان کے عوام ایک محسن کش فوجی جنرل کی سازش کا شکار ہو چکے تھے۔ اپنی طاقت کے نشے میں ''جی حضوریوں'' اور مخبروں کے گھیرے میں عوام سے تنہا ہونے والا بھٹو عوام میں واپس تو آ چکا تھا لیکن وہ ضیاء الحق حکومت کا پہلا قیدی تھا جو پیپلز پارٹی کے بقول عدالتی قتل کا شکار بنا۔ گڑھا تو اس کے لیے ضیاء الحق سے پہلے اس کے سندھ اور پنجاب کے غلام مصطفیٰ جتوئی اور صادق قریشی جیسے وزرائے اعلیٰ کھود چکے تھے جنھوں نے اسے انیس سو ستتر میں ''بڑی اکثریت سے جیت'' کی نوید سنائی تھی۔

''ہمارے کسی نوکر کو بھی کسی جرم میں سزا نہیں ہوئی اور ذوالفقار علی بھٹو جیسے آدمی کو قتل کے مقدمے میں سزا ہوئی۔'' یہ ذوالفقار علی بھٹو کی پہلی بیگم نسرین امیر سے مجھے ایک انٹرویو میں بطور تأسف کہا گیا۔

www.bhutto.org

''درداں دی ماری لدڑی علیل ہے'' سرائیکی کا یہ مصرع بھٹو نے اپنی سزائے موت کی اپیل سننے والی سپریم کورٹ کے سامنے اپنی دفاعی تقریر میں پڑھا تھا۔ بھٹو نے اپنی اسی تقریر میں پارٹی کے کارکنوں کے قذافی سٹیڈیم میں پولیس کے ہاتھوں لاٹھی چارج کے دوران بیگم نصرت بھٹو کے زمین پر گرتے ہوئے خون سے اپنی چادریں رنگنے کی بھی بات کی۔

بھٹو کی سپریم کورٹ کے دفاعی تقریر سننے کے لیے اس کے مقدمے کی سماعت کے دوران موجود رہنے والے قاضی عابد بھی بعد میں جا کر ضیاء الحق کے وزیر بنے۔

سپریم کورٹ میں بھٹو کی سزائے موت برقرار رکھے جانے والے فیصلے سے اختلاف کرنے والے واحد جج جسٹس دراب پٹیل نے اپنے آخری دنوں میں ایک صحافی کو اپنے انٹرویو میں ذوالفقار علی بھٹو کیس کی اندرونی کہانی سے پردہ اٹھایا تھا۔

www.bhutto.org

سیاسی انتقام

آخر کار سندھ کے وزیر اعلیٰ ارباب غلام رحیم کے منہ سے سچی بات نکل ہی گئی کہ اگر سندھ حکومت چاہتی تو آصف علی زرداری کو بکری کی چوری کا مقدمہ قائم کر کے بھی جیل میں رکھا جا سکتا تھا۔

سیاسی مخالفوں کے خلاف انتقام پسندی کو ''فائن آرٹ'' میں تبدیل کر دینے میں پاکستان میں یکے بعد دیگرے آنے والی حکومتیں ایک دوسرے سے بازی لیتی رہی ہیں اور پاکستان کے ماضی بعید اور قریب کی سیاسی تاریخ حکمرانوں کے ہاتھوں اپنے سیاسی مخالفوں کے خلاف انتقام پسندی میں اتنے اونچے اور گھٹیا طریقوں والی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔

اپنی بود و باش نہ پوچھو، ہم سب بے توقیر ہوئے
کس کی ہے دستار سلامت ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے

احمد فراز نے میر تقی میر کی زمین میں یہ شعر اپنی مشہور نظم شہر آشوب میں ضیاء الحق حکومت کے ہاتھوں اپنے سیاسی مخالفوں کے خلاف ہونے والی کارروائیوں پر لکھا تھا۔

ضیاء الحق حکومت کے دست ستم کا نشانہ اب ذوالفقار علی بھٹو، ان کا خاندان، پارٹی اور پارٹی کے حمایتی سب سے زیادہ بن رہے تھے، یعنی کہ کل کا میکاولی آج کا منصور بنا دیا گیا تھا۔

یہ ذوالفقار علی بھٹو ہی تھے جنھوں نے سیاسی مخالفوں کو اپنے خلاف اٹھنے والی کسی بھی بات پر انتقام پسندی کو ایک طرح سے ''فائن آرٹ'' میں بدل دیا تھا۔

بھٹو حکومت کے وزرائے اعلیٰ، وزیر و مشیر، پولیس ایس پی، ڈی سی، حتیٰ کہ تھانیدار، انٹیلی جینس، ایجنسیاں، عوامی حکومت کے ''گستاپو'' بنے ہوئے تھے۔

www.bhutto.org

ذرا تصور کریں چودھری ظہور الٰہی جیسے آدمی کو بھٹو کی مخالفت کرنے پر بھینسوں کی چوری کا مقدمہ قائم کر کے قید میں رکھا گیا۔ ہر چھوٹے بڑے بھٹو مخالف کے خلاف کرائمز کنٹرول ایکٹ اور ڈیفنس آف پاکستان رولز (ڈی پی آر) جیسے آمرانہ قوانین کا بے جا اور بے دریغ استعمال کیا گیا جن کے شکار تیرہ چودہ سال کے بچے بھی تھے تو دیال داس کلب حیدر آباد کے پچاس سالہ ہندو بزرگ بھی۔

اس پر ایک شاعر نے تب کہا تھا:

سوچ بند اور لوچ بند گفتار ڈی پی آر میں
ذہن پر زنجیر ہے اور یار ڈی پی آر میں

حالاں کہ بھٹو حکومت سے پہلے ڈی پی آر جیسے قانون اور نظر بندی کا اطلاق بہت کم اور غالباً خان عبدالغفار خان، جی ایم سید اور خود بھٹو اور ان کے ساتھیوں کے خلاف ایوب خان کی حکومت کے دنوں میں ہوتا تھا اور حکومت وقت کے سیاسی مخالفین کے اندھا دھند استعمال کو ہی حبیب جالب نے ''صبح بے نور'' قرار دیا تھا جب انھوں نے اپنی یہ نظم لکھی:

ایسے دستور کو صبح بے نور کو میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا

ایوب خان اور ان کی آمرانہ حکومت کے خلاف شاعری کرنے پر حبیب جالب کے خلاف ایوب خان کو ان کے درباریوں نے مسروقہ شراب دو بوتلیں برآمد کر کے انھیں گرفتار کروانے کا مشورہ دیا۔

لیکن کہا جاتا ہے کہ ایوب خان کے سیکریٹری اطلاعات الطاف گوہر نے ان سے کہا تھا کہ حبیب جالب کے خلاف اس طرح کا مقدمہ خود حکومت پر جگ ہنسائی کا موجب بنے گا ''کیوں کہ کوئی بھی شخص یہ مانے گا نہیں کہ حبیب جالب کے تھیلے سے شراب کی دو بوتلیں اور وہ بھی سالم و سلامت برآمد ہوئی ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کی ایوب خان کی حکومت سے علیحدگی اور اس کی مخالفت پر بھٹو کے خلاف اپنی زرعی زمین پر سرکاری بلڈوزروں کی ناجائز استعمال اور اسلحے کے مقدمے قائم کیے گئے۔

لیکن جب ''قائد عوام'' بھٹو عوامی اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھے تو ان کی حکومت

www.bhutto.org

نے سیاسی مخالفوں یا پھر خود بخود دوست ہوں یا دشمن کو بھٹو مخالف سمجھ بیٹھنے پر ان کے خلاف بہت ہی اوچھے اور گھٹیا طریقوں کی مثالیں قائم کیں اور تو اور ''استاد دامن جیسے مفکرین اور پنجابی شاعر کے لاہور والے حجرے سے بھی بھٹو حکومت نے ''بم کی برآمدگی'' دکھلائی۔ ''اُستاد دامن کے حجرے سے نہ تے کوئی کڑی نہ شراب! وہ بھی بم'' لاہوریوں کی عقل نے حکومت عقل سلیم کو ماننے سے انکار کردیا۔ لیکن اُستاد دامن نے اپنے ساتھ بھٹو کے ایسے سلوک پر یوں کہا:

کی کری جاندا ایں، کی کری جاندا ایں!
کدی روس جاندا ایں تے کدی چین جاندا ایں
آپے کرسی تے بیٹھ کے ساڈی گدی بھی کھچی جاندا ایں

(کیا کیے جاتے ہو، کیا کیے جاتے ہو
کبھی روس جاتے ہو تو کبھی چین جاتے ہو
خود کرسی پر بیٹھ کے ہماری گدی بھی کھینچے جاتے ہو)۔

یہ بھی بھٹو کا عوامی دور تھا جس میں مطلوب سیاسی کارکن نہ ملنے پر ان کی ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کو گرفتار کرکے تھانوں میں رکھا گیا۔

یہ بھی تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ ایسے ہی کل کے بھٹو حکومت کے معتوب سیاسی کارکنوں اور رہنماؤں میں سے ایک اچھی خاصی تعداد آج کے پیپلز پارٹی میں شامل ہے۔

بھٹو کے سیاسی مخالفین سے ایسے ''حسن سلوک'' والے ''آرٹ'' سے جتنا جام صادق علی نے سیکھا اتنا شاید سکندر اعظم نے ارسطو کی تعلیمات سے بھی نہیں سیکھا ہوگا۔

پاکستان میں ضیاء الحق اور سندھ میں جام صادق علی کی حکومتیں سیاسی مخالفین کے خلاف فسطائی ہتھکنڈوں میں اپنی مثال آپ تھیں جن کا سب سے زیادہ نشانہ پاکستان پیپلز پارٹی والے بنے۔

لیکن بے نظیر بھٹو کے ایک دور حکومت میں اپنے ہی منحرف لیکن اقلیتی رکن پارلیمان رانا چندر سنگھ کے بیٹے ہمیر سنگھ کے خلاف شکار پور میں بیلوں کی چوری کا مقدمہ درج کیا گیا اور دوسرے دور حکومت میں سندھ میں عبداللہ شاہ کی حکومت کے دنوں میں ایک

www.bhutto.org

سیاسی مخالف اور سابق وزیر جیل خانہ جات سید کوڑل شاہ کے خلاف سیہون میں دوکان کو نب لگا کر چائے کی پتی چوری کرنے کا الزام لگایا گیا۔ اگر کوئی وزیر اعلیٰ بنتا ہے تو سب سے پہلے تین کام کرتا ہے، اپنے گاؤں میں نیا بنگلہ تعمیر کرواتا ہے، نئی شادی کرتا ہے اور اپنے سیاسی مخالفوں کو جیل میں ڈلواتا ہے۔

حال ہی میں سندھ کے وزیر اعلیٰ کی مخالفت کرنے پر ڈیپلو کے سمیجو اور ان کے صحافی بھانجے کو ''بکری کی چوری'' کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ ایسا ہی سلوک پاکستانی حکمران اپنے سیاسی مخالفین سے کرتے آئے ہیں۔ پھر کبھی حکمران آصف زرداری ہے تو کبھی سیاسی مخالف شیخ رشید، کبھی حکمران ارباب رحیم ہے تو سیاسی مخالف کوئی ہو'' لیکن ایک دوسرے کو بھینسوں، بکریوں او بیلوں کی چوری کے مقدموں میں پھنسانے والے فارمولے وہی ہیں۔ نہ وقت سے حکمرانوں نے سیکھا اور نہ سیاسی مخالفوں نے۔ بلکہ وہ (حزب مخالف والے) بھی حکمرانوں کو کہتے آئے ہیں: ''تشدد اتنا کرو جتنا کل برداشت کرسکو۔

www.bhutto.org

تضادات سے بھرا انسان

یہ سن انیس سو چون کی بات ہے کہ مظفر علی متصوری جو ان دونوں خبر رساں ایجنسی میں تھے لکھتے ہیں کہ چھبیس سال کا ایک نوجوان جو لباس سے نرا ''ٹیڈی بوائے'' نظر آتا تھا، پتلی موری والی ٹانگوں سے چپکی ہوئی پتلون، جسم پر کسا ہوا کوٹ، چمک دار غیر ملکی جوتے اور چال ایسی کہ جیسے کوئی رقص پر موسیقی کی تیز دھن سے قدم ملا رہا ہو۔

یہ ذوالفقار علی بھٹو تھے جو کی برکلے یونیورسٹی سے فارغ ہو کر تازہ تازہ پاکستان لوٹے تھے اور کراچی میں وکالت شروع کی تھی۔ اس زمانہ میں وہ سندھ کے مشہور وکیل رام چندانی ڈنگومل کے چیمبر سے منسلک تھے۔

گاندھی گارڈن کے عقب میں اس علاقہ میں جو گارڈن ایسٹ کہلاتا تھا یہ اپنے والد سر شاہنواز کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ میں اس زمانہ میں اسی علاقہ میں رہتا تھا اور گاہے بگاہے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔

سندھ چیف کورٹ کے چائے خانہ میں مجھے دیکھ کر ہی وہ ہماری میز پر آئے تھے اس دن وہ بہت خوش تھے کہنے لگے کہ آصف، مجھے پہلا مقدمہ ملا ہے جو بہت اہم ہے۔

سندھ کے..... رہنما حیدر بخش جتوئی کو ایوب کھوڑو نے گرفتار کر لیا ہے۔ میں ان کی حبس بے جا کی درخواست داخل کرنے حیدر آباد جا رہا ہوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ بد بخت کھوڑو مجھے بھی پکڑے لے گا۔

پر کچھ توقف کے بعد بولے اگر چار دن کے بعد میں کراچی واپس نہ آیا تو تم میرے لیے حبس بے جا کی درخواست داخل کر دینا۔

میں نے اور میشر حسن کا بھٹو صاحب سے تعارف کرایا۔ مجھے علم تھا کہ ان کے

والد سر شاہنواز انھیں سفارت کار بنانا چاہتے تھے اور وہ انھیں لے کر ایوب کھوڑو کے پاس گئے تھے لیکن انھیں بے التفاتی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے کہا کہ بھٹو صاحب سفارت کار بننا چاہتے ہیں۔

منصوری صاحب نے پوچھا کہ کیوں سیاست میں آنے کا کوئی ارادہ نہیں؟

اس پر بھٹو صاحب نے کہا ارادہ تو ہے لیکن.....

میں نے پوچھا لیکن کیا؟

وہ بولے کوئی جماعت مناسب نظر نہیں آتی۔ پھر خود کہا کہ مسلم لیگ زمینداروں اور جاگیرداروں اور عہد رفتہ کے سیاست دانوں کی جماعت ہے۔

میں نے ازراہ تفنن کہا تو پھر کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں۔

کہنے لگے نظریات بھلے خوشنما ہوں لیکن میرے مزاج کے مطابق نہیں۔

منصوری صاحب نے کہا ہاں عیش و عشرت کی زندگی ترک کرنی ہوگی اور جاگیرداروں کا چولا اتار کر مزدوروں اور کسانوں میں کام کرنا پڑے گا۔

میں نے کہا کہ آزاد پاکستان پارٹی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس ترقی پسند پارٹی میں تو پڑھے لکھے روشن خیال لوگ ہیں اور خود ان کے وکالت کے پیشہ سے تعلق رکھنے والے ممتاز افراد ہیں جیسے بیرسٹر نور العارفین، محمود علی قصوری اور فخر الدین جی ابراہیم وغیرہ۔

بھٹو صاحب کہنے لگے وہاں پہلے ہی سے میاں افتخار الدین اور شوکت حیات ایسے جاگیرداری سیاست دان ہیں، میں ان میں گھنا جاؤں گا۔

منصوری صاحب نے سوال کیا کہ عوامی لیگ کے بارے میں انھوں نے نہیں سوچا؟

بھٹو صاحب بولے اس پارٹی کی جڑیں بنگال میں ہیں، اس کے مسائل اور اس کی شبیہہ بنگالی ہے پاکستان کے اس مغربی حصے میں یہ کبھی مقبولیت حاصل نہیں کر سکے گی۔

مشیر حسن نے برجستہ کہا کہ اب صرف جماعت اسلامی بچ گئی ہے۔

اس پر انھوں نے زور دار قہقہہ لگایا اور کہا کہ ''میں اور ملاؤں کی جماعت میں شامل ہوں؟''

میں نے کہا کیوں نہیں ''دین بھی مل جائے گا اور دنیاوی سیاست میں بھی نام

www.bhutto.org

ہوگا۔"

کہنے لگے نہیں وہاں مجھ جیسے روشن خیال شخص کی گنجائش نہیں۔

یہ تھا ہمارا پہلا مفصل تعارف ذوالفقار علی بھٹو سے۔ بڑے زمیندار سر شاہنواز بھٹو کا بیٹا، ناز و نعمت میں پلا بڑھا، عیش و عشرت سے سرشرا جو غریب ہاریوں کے رہنما کا مقدمہ لڑنے جارہا تھا اور جو ملک کی سیاست میں آنے کا آرزو مند ہے لیکن کوئی جماعت اسے خاطر خواہ نظر نہیں آتی۔

اس ملاقات میں ذوالفقار علی بھٹو کی تضادات سے بھری شخصیت آشکار ہوگئی تھی۔

پھر ایک عرصہ گزر گیا۔ بھٹو صاحب کو نہ تو کوئی بڑا مقدمہ ملا ویسے انھیں ضرورت بھی نہیں تھی۔ زیادہ تر وقت ان کا اشرافیت کی شبینہ پارٹیوں میں گزرتا تھا یا پھر لاڑکانہ میں المرتضیٰ میں جہاں وہ صاحب اثر اور صاحب ثروت افراد کو تیتر بٹری کے شکار کی دعوتیں دیتے تھے۔

فوج کے دروازے سے سیاست میں

اکتوبر سن اٹھاون میں پاکستان میں پہلی بار جنرل ایوب خان کی قیادت میں فوج نے ملک فیروز خان نون کی حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کیا۔ اس مارشل لاء کے تحت گورنر جنرل اسکندر مرزا نے جو کابینہ تشکیل کی اس میں انھوں نے ذوالفقار علی بھٹو کو وزیر تجارت مقرر کیا۔ وجہ تسمیہ اس کی وجہ یہ تھی کہ بھٹو صاحب کے جنرل اسکندر مرزا سے ناہید اسکندر مرزا اور نصرت بھٹو کی دوستی کے ناطے قریبی تعلقات تھے اور اسکندر مرزا کئی بار شکار کھیلنے لاڑکانہ جاچکے تھے۔

یوں بھٹو صاحب پہلی بار سیاست میں داخل ہوئے فوجی حکومت کی بیساکھی کے سہارے۔

بلاشبہ اس دور میں وزیر تجارت کی حیثیت سے بھٹو کا سب سے بڑا کارنامہ روس کو پاکستان میں فولاد کے کارخانہ کے قیام کے منصوبے کے لیے آمادہ کرنا تھا جس سے پاکستان میں صنعتی ترقی نے ایک نیا موڑ لیا۔ پھر سن تریسٹھ میں وزیر خارجہ کی حیثیت سے ان کا کارنامہ چین اور پاکستان کے درمیان سرحد کے تعین کے بارے میں سمجھوتہ تھا۔

www.bhutto.org

بھٹو کی سیاسی تقدیر پر فوج کی مہر

سن انیس سو اٹھاون میں فوجی حکومت کے راستے سیاست میں داخلے نے، ایسا جان پڑتا تھا کہ بھٹو صاحب کی سیاسی تقدیر پر فوج کی ایسی ان مٹ مہر ثبت کر دی ہے جس سے انھیں تختہ دار تک نجات نہیں مل سکی۔

انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ چوں کہ ان کا تعلق ملک کے ایک چھوٹے صوبہ، سندھ سے ہے لہٰذا اقتدار کے حصول میں انھیں فوج کے سہارے کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ہے اور اس کے لیے انھیں بہت قربانی دینی ہوگی۔

بنگلہ دیش کے بحران کے سلسلہ میں ان پر یہی الزام عاید ہوتا ہے کہ انھوں نے فوج کا موقف اختیار کیا اور شیخ مجیب سے ''اِدھر تم اُدھر ہم'' کے نعرے کی بنیاد پر دو بدو مقابلہ کیا اور مفاہمت کے تمام کواڑ بھیڑ دیے۔

پھر بنگلہ دیش کے قیام ک بعد انھوں نے ملک کی شکست خوردہ فوج کی امیج بحال کرنے کے جتن کیے، یہاں تک کہ فوج کی پرانی وردی بدل دی اور وعدہ کیا کہ وہ پاکستان کی فوج کو ایشیاء کی بہترین لڑاکا فوج بنا دیں گے اور فوج کو بدنامی سے بچانے کے لیے انھوں نے مشرقی پاکستان میں سیاسی اور فوجی ہزیمت کے بارے میں حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ کو مقفل رکھا اور کسی کو اس کی سن گن نہ ہونے دی۔ جب کہ اس وقت اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ قوم کھل کر ان عوامل پر بحث کرے جن کے نتیجہ میں ملک دولخت ہوا۔

پھر شکست خوردہ فوج کے سربراہ اور ملک کے ٹوٹنے کے حالات کے ذمہ دار جنرل یحییٰ کی معزولی کے بعد ان کی موت تک ان کے خلاف مقدمہ چلانے سے صاف انکار کیا۔ اس سلسلہ میں بلاشبہ امریکا کا بھی دباؤ تھا کہ یحییٰ خان پر ہاتھ نہ ڈالا جائے۔

فوج اور فوجی جرنیلوں کا خوف بھٹو صاحب کے ذہن پر بری طرح سے طاری تھا۔

مجھے یاد ہے کہ سن اکہتر میں سقوط ڈھاکہ کے بعد جب بھٹو صاحب سلامتی کونسل کے اجلاس میں شرکت کر کے جرنیلوں کے بلاوے پر وطن واپس جا رہے تھے تو وہ لندن کے ہیتھ رو ہوائی اڈہ پر رُکے۔ اتوار کا دن تھا۔ وی آئی پی لاؤنج میں ان کی اس زمانہ کے

www.bhutto.org

برطانوی وزیر خارجہ سر لیلک ڈگلس ہیوم سے ملاقات ہوئی۔

اس ملاقات کے بعد پتا چلا کہ جرنیلوں نے طیارہ لندن بھیجنے کے بجائے روم بھیجا ہے۔

اس پرواز کے لیے ہیتھ رو کے یورپی ٹرمنل پر جانا پڑا۔ روکی پرواز تین گھنٹے بعد تھی۔ اس دوران میں ان کے ساتھ تھا۔ ملک ٹوٹنے کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ مجھ سے زیادہ بات نہیں ہو رہی تھی اور بھٹو صاحب اس بات پر سخت پریشان تھے کہ جرنیلوں نے طیارہ روم کیوں بھیجا ہے۔ لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے وہ بولے "آصف، رباط کے اس ڈراما کا قصہ سناؤ جو یحییٰ خان کو پیش آیا تھا۔" میرا دل دھک سے رہ گیا کہ اس وقت جب ملک پر ایسی آفت آن پڑی ہے بھٹو صاحب یحییٰ خان کی ان کرتوتوں کا وہ قصہ سننے کے لیے بے تاب ہیں جو رباط میں پہلی اسلامی سربراہ کانفرنس کے دوران پیش آیا تھا اور جو میں نے انھیں سن انہتر میں لندن میں سنایا تھا جب وہ پیپلز پارٹی کی تنظیم کے سلسلہ میں یہاں آئے تھے۔

میں نے دل میں سوچا یہ کوئی وقت ہے ایسے قصوں کا۔ میں نے موضوع بدلنے کے لیے ان کی تشویش کو دہرایا کہ آخر جرنیلوں نے طیارہ روم کیوں بھجوایا ہے؟ کہنے لگے کہ کم بخت جنرل ان کا طیارہ کریش تو نہیں کرا دیں گے؟"

میں نے ان کو تسلی دی کہ اس وقت فوکر ان کی سخت ضرورت ہے ملک کے سنگین ترین بحران سے نکلنے کے لیے۔ میں نے کہا سن اٹھاون میں فوج کو ان کی اتنی ضرورت نہیں تھی جتنی کہ اس وقت تھی۔ میں نے کہا کہ وہ سن اٹھاون میں جب مارشل لاء کی حکومت میں شامل ہوئے تھے تو اس وقت ان کی سیاسی قوت ہیں تھی لیکن اب وہ بچی کھچی پاکستان کی پارلیمنٹ میں اکثریتی پارٹی کے سربراہ ہیں۔

بھٹو صاحب کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ یہ باتیں سننے کے لیے بے تاب تھے۔

سن بہتر کے اوائل میں بھٹو جب ایران، ترکی، مراکش، تیونس، الجزائر، لیبیا، مصر اور شام کے دورے پر نکلے تو سب سے پہلے انھوں نے سب سے پہلے ترکی میں دارالحکومت انقرہ کی پہاڑی پر کمال اتاترک کے مقبرہ پر حاضر دینے کے بعد بھٹو صاحب نے وہاں رکھی کتاب میں کمال اتاترک کو خطاب کرتے ہوئے لکھا کہ جس طرح شکست خوردہ ترکی کو

www.bhutto.org

انھوں نے پرآشوب دور میں سنبھالا تھا اور اس کا احیاء کیا اور اس کی عظمت کو بحال کیا اسی چیلنج سے وہ اپنے ملک میں دوچار ہیں۔

پھر جب دمشق میں انھوں نے آٹھ ملکوں کا دورہ مکمل کیا تو شام کے صدر حافظ الاسد کے ساتھ ایک مشترکہ پریس کانفرنس میں انھوں نے کہا کہ ان کا یہ دورہ نشاۃ ثانیہ کا سفر تھا اور پاکستان کی مہارت اور عرب سرمایہ کے اشتراک سے ہم عالم اسلام کی ترقی اور قوت کے نئے دروازے کھول سکتے ہیں۔ بھٹو صاحب کا واضح اشارہ جوہری توانائی کے میدان میں اشتراک کی طرف تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ بھی جو بھٹو صاحب کے سیاسی حریف تھے اور اب بھی ان کی سیاست کے مخالف ہیں وہ اس بات کے معترف ہیں کہ پاکستان نے جوہری اسلحہ کے میدان میں جو کچھ حاصل کیا ہے اس کا سہرا ذوالفقار علی بھٹو کے سر ہے اور دراصل اسی وجہ سے انھیں خمیازہ، اقتدار سے محرومی اور تختہ دار کی شکل میں دینا پڑا۔

یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ سن اکہتر میں بھٹو نے بنگلہ دیش کے بحران میں فوج کا بھرپور ساتھ دیا اور پھر فوج کے ہاتھوں دولخت پاکستان کو بُرے وقت سنبھالا لیکن اسی فوج نے سن ستتر میں ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اناسی میں تختہ دار پر چڑھا دیا۔

آخری ملاقات

بھٹو صاحب سے ہماری آخری ملاقات جولائی سن تہتر میں لندن میں ہوئی تھی جب وہ برطانیہ کے سرکاری دورہ پر آتے تھے۔ یہ خاصی طویل ملاقات تھی شرط ان کی یہ تھی کہ اس کے بارے میں ایک لفظ بھی باہر نہیں آئے گا۔ وہ نہ جانے کیوں ماضی کی یادوں کو بار بار کرید رہے تھے خود انھوں نے سن چون کی سندھ چیف کورٹ کی ملاقات یاد دلائی اور شکایتاً کہا کہ میں یہ طعنہ دیتا تھا کہ وہ سیاست میں فوج کے بل پر آئے ہیں لیکن لوگ اس بات کا اعتراف کیوں کر نہ کرتے کہ انھوں نے پاکستان کی سیاست کو زمینداروں اور جاگیرداروں کے محلات سے نکال کر عوام کے حوالہ کی۔

وہ مزید لکھتے ہیں کہ ہمیں بھٹو صاحب کے جاگیردارانہ انداز کا بخوبی احساس تھا اور پورا علم تھا کہ وہ اپنی کوئی مخالفت اور نکتہ چینی برداشت کرنے کے عادی نہیں۔ مجھے ان

کے نہاتی سہل موڈ سے ہمت ہوئی۔ میں نے کہا بلاشبہ پاکستان کی تاریخ میں یہ بات ہمیشہ روشن رہے گی لیکن اس نکتہ چینی سے آپ دامن نہیں بچا سکتے کہ پیپلز پارٹی کے قیام کے وقت جو ترقی پسند لوگ آپ کے ساتھ تھے وہ لوگ جنھوں نے سن ستر کے انتخابات میں آپ کو اور آپ کی پارٹی کو فتح سے ہمکنار کرایا وہ اقتدار کے حصول کے بعد بہت جلد یکے بعد دیگرے آپ سے جدا ہو گئے۔ پھر آپ نے اپنی پیپلز پارٹی کا تمام تر انتظام ایک سرکاری افسر وقار احمد کے حوالے کر دیا ہے۔

لوگ اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ آپ ملک میں صدارتی نظام قائم کرنے کے زبردست خواہاں تھے لیکن آپ نے عوام کی اکثریت اور ان جماعتوں کی رائے کا خیال رکھا جو ملک میں پارلیمانی جمہوریت چاہتی تھیں اور آپ نے آئین انہی خواہشات کے مطابق مرتب کیا۔ لیکن اسی کے ساتھ لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اس کے فوراً بعد آپ نے سرحد اور بلوچستان میں حزب مخالف کی نیپ کی حکومتیں برطرف کر دیں۔

بھٹو صاحب نے موضوع بدلتے ہوئے کہا کہ سن تریسٹھ کے وہ دن یاد ہیں جب دلی اور کلکتہ میں کشمیر کے بارے میں سردار سورن سنگھ سے مذاکرات کے دوران ملاقاتیں ہوئی تھیں اور ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے بارے میں بحث ہوئی تھی۔

کشمیر کے ذکر پر مجھے آپریشن جبرالٹر اور اس کے بعد سن پینسٹھ کی جنگ کے سلسلہ میں بھٹو صاحب کے رول پر سخت نکتہ چینی یاد آئی کہ انھوں نے کشمیر میں انھوں نے صورت حالات کا صحیح تجزیہ نہیں کیا اور آنکھ بند کر کے چار ہزار کمانڈوز وادی میں جھونک دیے یہ جانے بغیر کہ کشمیر کے عوام کی انھیں حمایت ملے گی یا نہیں۔ پھر سن پینسٹھ کی جنگ میں یہ سوچے بغیر کہ اگر امریکا اور برطانیہ نے اسلحہ کی سپلائی بند کر دی تو جنگ کیسے جاری رکھی جائے گی صدر ایوب خان کو اس جنگ میں کودنے پر مجبور کیا۔ ان سب باتوں کا ذکر میں کرنا چاہتا تھا لیکن عمداً نہیں کیا کیوں کہ رات کافی گذر چکی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ ملاقات بھٹو صاحب کی ناراضگی اور غصہ پر ختم ہو۔

واپسی پر میں یہ سوچتا آیا کہ کس قدر تضادات ہیں ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت میں۔ ایک طرف ایسی سیاسی بصیرت جس کا پاکستان کے سیاست دانوں میں سخت فقدان رہا ہے۔ روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم سے لیس دوسری طرف خالص جاگیردارانہ تحکمانہ اور آمرانہ

www.bhutto.org

اور بھارت وزیر اعظم کے دفتر کے ایک ترجمان کے مطابق اٹل بہاری واجپائی اور بے نظیر بھٹو کی ملاقات سیاسی نوعیت کی نہیں تھی۔ یہ ملاقات اس لیے ہوئی کہ بے نظیر بھٹو دہلی آئی ہوئی تھیں۔

بے نظیر بھٹو نے جو پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بھی ہیں، بھارت کے نائب وزیر اعظم لال کرشن ایڈوانی سے بھی ملاقات کی۔ کھانے پر ہونے والی یہ ملاقات ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہی۔

سیمینار میں اپنی تقریر میں بے نظیر بھٹو نے کہا کہ ان کے لیے ہندوستان جا کر اس کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ سیاسی وجہات کے باعث مشکل تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ جنوبی ایشیاء میں امن کے لیے اگر میں کچھ کر سکوں تو سودا برا نہیں ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ بس ڈپلومیسی اور آگرہ کانفرنس کی ناکامی کے باوجود بھارتی وزیر اعظم نے قابل تعریف حد تک پاکستان سے صلح کی کوشش کی ہے اور بھارت کی جانب سے حال ہی بارہ نکاتی امن پیکج کا اعلان بھی ہوا ہے۔ اس وقت پاکستان کے فوجی حکمران کھلم کھلا کہتے ہیں کہ وہ بھارت کے ساتھ تعلقات کی بحالی چاہتے ہیں۔ تو کیوں نہ انھیں آزمایا جائے۔ اگر وہ غلط کہتے ہیں تو عوام کے سامنے بے نقاب ہو جائیں گے اور اگر وہ صحیح کہتے ہیں تو بھلائی بھی عوام ہی کی ہوگی۔

انھوں نے کل جماعتی حریت کانفرنس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ اس نے اندرونی اختلافات کے باوجود بھارت کے ساتھ مذاکرات کے دروازے بند نہیں کیے۔ ان کا کہنا تھا کہ ماضی میں بھی بھارت نے حریت کانفرنس کو مذاکرات کی دعوت دی تھی اور شدت پسندوں کے ساتھ جنگ بندی کا اعلان بھی کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ایسا ایک اور اعلان پھر کیا جانا چاہیے۔

پیپلز پارٹی کی رہنما نے کہا کہ متنازعہ معاملات پر بھارت اور پاکستان کے موقف مختلف ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف جوہری ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکیاں دیں۔

انھوں نے سوال کرتے ہوئے کہا کہ چین اور بھارت کے درمیان سرحدی تنازع ہے لیکن کیا وہ ایک دوسرے کو دھمکیاں دیتے ہیں۔ یا چین اور امریکا کے بیچ تائیوان کی وجہ

www.bhutto.org

سے نزع ہے لیکن دوسروں کے درمیان تجارتی تعلقات بہت اچھے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے دھمکیاں نہیں ہیں۔ تو جب یہ ممالک اختلافی امور کے باوجود آرام سے رہ سکتے ہیں تو پاکستان اور ہندوستان کیوں نہیں رہ سکتے۔

ادھر پاکستان سے آئے ہوئے عوامی نیشنل پارٹی کے رہنما اسفند یار ولی نے بھارت کے وزیر خارجہ یشونت سنہا سے ملاقات کی۔ بھارت کی وزارتِ خارجہ کے ترجمان کا کہنا ہے یشونت سنہا نے اسفند یار ولی کو ہندوستان کی طرف سے پاکستان کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی تازہ ترین کوششوں کے بارے میں بریف کیا۔

انھوں نے خطے میں معاشی تعاون کے فروغ اور عوامی سطح پر رابطوں میں اضافے کی ضرورت پر زور دیا۔

اسفند یار ولی کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے بھارت کے ساتھ اپنی جماعت کے روایتی تعلقات کی اہمیت کا اعادہ کیا اور کہا کہ ان کی جماعت ایسی سیکولر اور معتدل جمہوریت کی حامی ہے جس میں برداشت بھی ہو۔

www.bhutto.org

1970ء کے انتخابات اور پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کا قیام

ایوب خاں نے جس قسم کے حالات میں اقتدار یحییٰ خاں کے حوالے کیا تھا ان حالات میں اگر یحییٰ خاں چاہتے تو ڈنڈے کے زور پر سیاستدانوں کو جیلوں میں بند کر کے انتخابات کو کئی برس کے لیے ملتوی کر سکتے تھے لیکن انھوں نے مارشل لاء لگانے کے چند ماہ بعد ہی سیاستدانوں کو محدود پیمانے پر سیاسی سرگرمیوں کی اجازت دے دی جب کہ انتخابات کے لیے 5/اکتوبر 1970ء کی تاریخ طے کر دی گئی۔ تاہم ستمبر، اکتوبر 1970ء میں مشرقی پاکستان میں سیلاب کی تباہ کاریوں کے باعث الیکشن 7 دسمبر 1970ء تک ملتوی کر دیے گئے۔ اس دوران سیاستدانوں نے ایک دوسرے کے اوپر کیچڑ اچھالنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن کی پاکستان کے خلاف سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ مغربی پاکستان میں بھٹو کی مقبولیت کو دیکھ کر یحییٰ خاں نے کوشش کی کہ کم از کم حکومت کے زیر کنٹرول اخبارات میں بھٹو کی تقریریں شائع نہ ہونے دی جائیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھٹو کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب 7 دسمبر 1970ء کو انتخابات ہوئے تو مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اور مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو بھاری اکثریت سے جیت گئے اور دونوں کی نظر وزارتِ اعظمیٰ پر تھی اور یہی وہ مسئلہ تھا جو یحییٰ خاں کے غلط فیصلوں کی وجہ سے ایسا الجھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے وزیراعظم بننے کے بجائے بنگلہ دیش کے قیام کے لیے کھل کر کوششیں شروع کر دیں جس پر ذوالفقار علی بھٹو نے اپنے خصوصی نمائندے غلام مصطفیٰ کھر کے ذریعے شیخ مجیب الرحمٰن سے رابطہ قائم کیا۔ کھر کی مجیب سے 2

www.bhutto.org

جنوری 1971ء کو ڈھاکہ میں ملاقات ہوئی جس میں طے پایا کہ انتقال اقتدار کا مسئلہ بھٹو اور مجیب مذاکرات کے ذریعے حل کریں گے۔ بھٹو اور مجیب کے درمیان ڈھاکہ میں 27 جنوری سے 29 جنوری 1971ء تک مذاکرات ہوئے جو نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مجیب وزارت اعظمیٰ حاصل کرنا چاہتے تھے جب کہ بھٹو بھی اسی عہدے کے حصول کے متمنی تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو اور مجیب الرحمٰن میں سے ایک صدر اور ایک وزیراعظم بن سکتا تھا لیکن مسئلہ درپیش یہ تھا کہ جنرل یحییٰ خاں نے ایوان صدر کو خالی کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انھوں نے بھٹو اور مجیب دونوں کو کہا کہ وہ انتقال اقتدار کو یقینی بنانے کے لیے انھیں متفقہ صدارتی امیدوار کے طور پر قبول کر لیں۔ یحییٰ خاں نے 15 فروری 1971ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا تھا لیکن بھٹو نے 11 فروری 1971ء کو انھیں کہا کہ کم از کم 6 ہفتوں تک اجلاس ملتوی کر دیں کیوں کہ ابھی ان کے مجیب الرحمٰن کے ساتھ مذاکرات مکمل نہیں ہو سکے۔ جس پر یحییٰ خاں نے اجلاس کی نئی تاریخ یکم مارچ مقرر کر دی۔ بھٹو اور مجیب کے درمیان یکم مارچ تک سمجھوتہ نہ ہونے کی وجہ سے یحییٰ خاں نے قومی اسمبلی کا اجلاس دوبارہ ملتوی کر دیا اور گورنر حضرات کی جگہ صوبوں میں مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مقرر کر دیے گئے۔ گویا اس طرح یحییٰ خاں سیاستدانوں کو بتانا چاہتے تھے کہ انھیں کمزور نہ سمجھا جائے۔ یحییٰ خاں نے 25 مارچ 1971ء کو دوبارہ طلب کیے جانے والے اجلاس کو 22 مارچ 1971ء تک ملتوی کر دیا۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی اور شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن نے ان اقدامات کے بعد مشرقی پاکستان میں محدود پیمانے پر فوجی اپریشن شروع کر دیا۔ اندرا گاندھی جون 1971ء میں ہی مشرقی پاکستان پر حملہ کرنا چاہتی تھیں لیکن موسمی حالات کی وجہ سے ایسا نہ کیا گیا جس کی وجہ سے سیاستدانوں کو اصلاح احوال کے لیے مزید چند ماہ کی مہلت مل گئی جسے یحییٰ خاں اور سیاستدانوں نے گنوا دیا۔ نتیجتاً مشرقی پاکستان میں بڑے پیمانے پر فوجی اپریشن ہوا اور 3 دسمبر 1971ء کو پاک بھارت جنگ شروع ہوگئی۔ مشرقی پاکستان کے محاذ پر شروع ہونے والی یہ جنگ آہستہ آہستہ مغربی پاکستان کی طرف بھی بڑھتی چلی گئی اور آخر کار 16 دسمبر 1971ء کو بھارتی افواج ڈھاکہ میں داخل ہوگئیں۔ ذوالفقار علی بھٹو اس وقت سیکورٹی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لیے امریکا گئے ہوئے تھے۔ فوج نے جب دیکھا کہ مشرقی

www.bhutto.org

پاکستان اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو مغربی پاکستان پر مشتمل ایک نیا پاکستان بنانے کے لیے بھٹو کو امریکا سے بلایا گیا جو 20 دسمبر 1971ء کی صبح اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترے۔ نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ذوالفقار علی بھٹو کے استقبال کے لیے فوج کے علاوہ ان کے قریبی ساتھی غلام مصطفیٰ کھر بھی موجود تھے۔ مصطفیٰ کھر کار ڈرائیو کرتے ہوئے بھٹو کو سیدھا ایوان صدر لے کر گئے جہاں انتقال اقتدار کے تمام انتظامات مکمل تھے۔ یحییٰ خاں نے اقتدار بھٹو کے حوالے کر دیا اور اس سہ پہر جب بھٹو کی کار ایوان صدر سے نکلی تو اس پر پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ بھٹو نے اقتدار سنبھالتے ہی جنرل یحییٰ خاں کے علاوہ جنرل عبدالحمید، جنرل مٹھا، جنرل پیرزادہ، جنرل عمر، جنرل خداداد خاں اور جنرل کیانی کو ریٹائر کر دیا۔

www.bhutto.org

وہ چپ لگی ہے!۔

اس وقت پاکستان کے پندرہ کروڑ میں سے ساڑھے سات کروڑ افراد کی عمر پچیس برس یا اس سے کم ہے۔ میں کتنا بھی زور لگالوں، کوئی فقرہ استعمال کرلوں، کسی بھی لفظ کا سہارا لے لوں مگر ان ساڑھے سات کروڑ کو نہیں سمجھا سکتا کہ پچیس برس قبل چار اپریل کو پورے پاکستان کو کیسی چپ لگ گئی تھی۔

تعبیر کے بغیر خواب بیچنے والوں کے ساتھ جو ہوتا ہے، ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ وہی ہوا۔ ان کی لاش تو فوجی بندوقوں کے سائے میں دفن ہوئی لیکن ان کی سیاسی میراث کی تدفین ان کے وارثوں نے کی۔

انیس سو اکہتر میں پاکستان کے دو ٹکڑے ہونے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو جتنے اختیارات کے ساتھ یہ ملک سونپا گیا تھا وہ اگر چاہتے تو ان سے کام لیتے ہوئے موثر طور پر فوج کی غیر جانبدارانہ تطہیر کرکے اسے سیاست کنٹرول کرنے کے شوقین ادارے سے دوبارہ پیشہ ورانہ فوج کی سطح تک لاسکتے تھے۔ ایک وقت تو یہ بات بھی ان کے بس میں لگتی تھی کہ وہ پاکستان کو جاگیردارانہ سماج سے صنعتی سماج کے رُخ پر ڈال سکتے ہیں۔ وہ اتنے مقبول رہنما تھے کہ پاکستان میں جمہوری بنیادوں کو مضبوط کرتے ہوئے ہر ادارے کو پارلیمنٹ کے زیردست لانے کی مثال قائم کرسکتے تھے۔ وہ لمبے چوڑے دعوے کرکے بین الاقوامی سفید ہاتھیوں کے کان میں خطرے کی گھنٹی بجائے بغیر کسی حد تک اپنا علاقائی اور پان اسلامک ایجنڈہ بھی آگے بڑھا سکتے تھے۔ لیکن شخصی اور نفسیاتی تضادات کے سبب وہ ان میں سے کوئی بھی مقصد حاصل نہ کرسکے۔

ہاں! ذوالفقار علی بھٹو کو یہ ادراک ضرور تھا کہ عوامی طاقت کو کس طرح چابکدستی

www.bhutto.org

کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے شاید یہی وہ نکتہ تھا جس کے سبب ان کی موت کے کئی برس بعد تک بہت سے لوگوں کے دل میں یہ امید زندہ رہی کہ جس سیاست کو بھٹو ڈرائنگ روم سے کھینچ کر سڑک پر لائے تھے وہ اب دوبارہ ڈرائنگ روم میں پناہ نہیں لے سکے گی۔ لیکن ان کی پھانسی کے بعد سے اب تک بیلٹ بکس کے ہوتے ہوئے بھی پاکستان میں جو سیاسی حکومتیں بنیں وہ سڑک کے راستے نہیں بلکہ ڈرائنگ روم کے پچھلے دروازے سے سڑک کے لوگوں کے سامنے پیش کی گئیں۔

پچیس برس قبل ایسا لگتا تھا جیسے زندہ بھٹو سے زیادہ طاقتور مردہ بھٹو ثابت ہوگا لیکن آج ذوالفقار علی بھٹو محض ایک ایسی تصویر کا نام ہے جو پاکستان کے سیاسی میوزیم میں متعدد تاریخی تصاویر کے درمیان رکھی ہے۔ ان کے نام پر ہر سال چار اپریل کو قرآن خوانی بھی ہوتی ہے۔ مقررین جمہوریت کی افادیت پر روشنی بھی ڈالتے ہیں۔ آمرانہ رجحانات کو دو چار گالیاں بھی پڑ جاتی ہیں۔ مزار پر حاضری دینے والے چادریں بھی چڑھاتے ہیں لیکن اس کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہو جاتے ہیں۔

اگر ذوالفقار علی بھٹو کے دور سے کسی نے کوئی سبق سیکھا ہے تو صرف اسٹیبلشمنٹ نے سیکھا ہے یعنی سیاست اور انتخابی عمل اتنا نازک اور اہم کام ہے کہ اسے محض عوام کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔

www.bhutto.org

یا الٰہی مرگِ یوسف کی خبر سچی نہ ہو

ٹی ایس ایلیٹ نے لکھا کہ ''اپریل ظالم ترین مہینہ ہے۔'' فیض صاحب نے بھی کہا تھا، ''پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں''، اس ظالم مہینے میں بھی ایک تاریخ خاص طور پر ظالم ہے۔ اپریل کی چار تاریخ کو کھلنے والے پھولوں میں لہو کا رنگ اور ظلم کی بو کیوں ہوتی ہے؟

اپریل کی چار تاریخ اور 1968ء کا سال۔ امریکا کے شہر میمفس میں پچھلی رات طوفان گھر کر آیا تھا۔ باہر سڑک پر تیز ہوا کے جھکڑ دیواروں سے سر پٹک رہے تھے۔ پانی کی بوندیں چھتوں پر جلترنگ بجا رہی تھیں۔ میسن چرچ کے بڑے ہال میں مارٹن لوتھر کنگ جذبوں کی آنچ میں سلگتے لفظوں کے انگارے اگل رہا تھا۔ انجیل کے سادہ مگر معجزے کی حد تک پر اثر استعاروں میں گندھی ہوئی زبان، چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایسے نشتر پروئے تھے کہ تین ہزار کا مجمع تڑپ اٹھتا تھا۔ آبشار جیسی رواں خطابت میں آگے بڑھنے کی لیے کار بھی تھی، راہ کی مشکلات کی خبر بھی اور پاڑی کے پاس سکھ کے گاؤں تک پہنچنے کی نوید بھی۔

اس رات مارٹ کنگ کے لب و لہجے میں استقلال اور گہرے اندوہ کا عجیب امتزاج تھا۔ شاید صرف انھیں معلوم تھا کہ یہ فی البدیہہ تقریر الوداعی پیغام بھی ہے۔

گالی شام چھ بجے، چار اپریل، لورین موتل کی بالکونی پر مارٹن لوتھر کنگ پہاڑی کے پاز اس وادی میں اتر چکا تھا کوئی جا کے جہاں سے آتا نہیں۔ گردن پر داہنی طرف رائفل کی گولی کا پھول کھلا تھا۔ انسانوں کے لیے آزادی، مساوات اور انصاف کا خواب دیکھنے والے نے آنکھیں موند لیں تھیں۔

اصل خبر سب سے آخر میں دی گئی۔ ''سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو آج علی

www.bhutto.org

صبح راولپنڈی جیل میں پھانسی دے دی گئی۔"

اس خبر کے اندیشے میں لاکھوں آنکھیں کئی ہفتوں سے رت جگے کا شکار تھیں۔ ہزاروں سیاسی کارکن، طالب علم اور صحافی عقوبت خانوں میں بدترین تشدد سہہ رہے تھے۔ بہت سوں نے احتجاج کرتے ہوئے خود کو شعلوں کی نذر کر دیا تھا ہر طرح کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی تھی۔ ہوا میں کوڑوں کی سرسراہٹ تھیں۔ اخبارات پہ کڑی سنسر شپ تھی۔ دن چڑھتے چڑھتے گلی کوچوں میں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں جمع ہونے لگیں۔ دبی دبی سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ اس روز پاکستان کے ان گنت گھروں میں چولہا نہیں جلا۔ ایک ان کہی دہشت تھی جو کواڑوں پہ برس رہی تھی۔ جیسے گھر میں موت واقع ہونے پر بچے سہم جاتے ہیں۔

ادبی جریدے فنون کا اگلا شمارہ شائع ہوا تو اس میں اختر حسین جعفری کی نظم "نوحہ" چھپی تھی۔ اردو ادب میں غالب نے میاں عارف اور اقبال نے داغ کے نوحے سے جو روایت شروع کی، اسے فیض نے کوئی درجن بھر نوحوں سے زندہ جاوید بنا دیا۔ مگر اختر حسین جعفری نے نوحہ تھوڑی لکھا تھا، گویا تلوار کے ظلم کی تاریخ کا استعارہ کاغذ پہ رکھ دیا تھا۔ تلمیحات کا خروش پر ایسا تاثر تھا کہ ضیاء الحق نے اسی نظم کے مصرعے دہرا کے اہل قلم کانفرنس میں ادیبوں کی "چھترول" کی تھی۔

اب نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
اب کسی ابجد سے زندانِ ستم کھلتے نہیں
سر سجادوں پہ بیٹھی بیبیوں نے
جس قدر حرف عبادت یاد تھے
پو پھٹے تک انگلیوں پہ گن لیے
اور دیکھا رحل کے نیچے لہو ہے
شیشۂ محفوظ کی مٹی ہے سرخ
سطر مستحکم کے اندر بست و درباقی نہیں
ایلچی کیسے بلاد مصر سے
سوئے کنعان آئے ہیں
اک جلوس بے تماشہ گلیوں بازاروں میں ہے
یا الٰہی، مرگ یوسف کی خبر سچی نہ ہو

www.bhutto.org

اور آخری لائنیں

اب سمیٹو مشک و عنبر
ڈھانپ دو لوح و قلم
اشک پونچھو اور ردائیں نوک پا تک کھینچ لو
کچی آنکھوں سے جنازے دیکھنا اچھا نہیں

اور یاناقلاشی سے بات کرتے ہوئے بھٹو نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا، ''ہم نے سیاست اپنے دریاؤں سے سیکھی ہے۔''

کیسا درست تجزیہ تھا۔ دریاؤں کی کیا خصوصیت ہے؟ یہی کہ جیسے بھی ہو پتھریلے پہاڑوں سے اپنے راہ نکالنا مگر موجوں کی الہڑ روانی برقرار رکھنا۔ سو اس کا پہلا حصہ بھٹو کی عملیت پسندی ہے اور دوسرا اس کی سیاست کا رومانی ڈھنگ۔

سیاست میں بعض دلائل کھوکھلے ہونے کے باوجود ریت کی بوریوں کی طرح مؤثر طور پر استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً پُرامن مقاصد کے لیے ایٹمی توانائی کا حق، دوسرے ممالک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر احتجاج اور اپنے ملک میں قومی خودمختاری کا جواز وغیرہ۔ بھٹو کے خلاف مقدمہ قتل کی دلیل بھی اسی طرح استعمال کی گئی۔ اس مقدمہ قتل کی قانونی حیثیت یہ ہے کہ ستائیس برس گزرنے کے باوجود پاکستان کی کسی چھوٹی یا بڑی عدالت میں آج تک نواب محمد احمد خان قتل کیس کی نظیر پیش نہیں کی گئی۔ 1860ء میں قانون تعزیرات ہند کے نفاذ کے بعد سے سوائے بھٹو کے کسی کو اعانت جرم کے الزام میں موت کی سزا نہیں دی گئی۔

بھٹو سیاست دان تھا۔ سیاست دانوں سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ بھٹو کی غلطیوں کی فہرست مختصر نہیں ہے لیکن سنہ 1977ء میں اقتدار پر شب خون مارنے والے جرنیلوں کو ان غلطیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دنیا بھر کے اسلحے، تابع فرمان انتظامیہ اور حکم کے غلام سیاستدانوں کی پوری حمایت کے باوجود 4/اپریل 1979ء کی رات جرنیلوں کے ہاتھ پاؤں اس لیے کانپ رہے تھے کہ بھٹو پاکستان کا آخری سیاستدان تھا جو عوامی مقبولیت کے بل پر فوج کے سیاسی عزائم کا راستہ روک سکتا تھا۔

ڈاکٹر اقبال احمد سیاسی تاریخ کی پیچیدگیوں کو سادہ لفظوں میں بیان کرنے کی

www.bhutto.org

خاص صلاحیت رکھتے تھے۔ 1988ء میں امریکا سے لاہور تشریف لائے۔ کسی مجلس میں ایک نوجوان بھٹو پر تنقید میں کچھ زیادہ ہی تلخ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے دھیرے سے کہا ''مگر میرے بھائی، بھٹو صاحب نے بڑی بہادری سے جان دی'' جدید عالمی تاریخ میں چلی کے صدر سلواڈور الاندے کے استثنا کے ساتھ یہ بات کتنوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔

اسی کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ بھٹو صاحب کی مقبولیت پسند سیاست نے لوگوں کو ٹوٹی پھوٹی عوامی حکومت کے صرف پانچ سال چھ مہینے اور پندرہ دن دیے۔ عوام کی محبت نے تو ذوالفقار علی بھٹو کو صدیاں بخشی ہیں۔

چار اپریل کو جان دینے والے مارٹن لوتھر کنگ اور ذوالفقار علی بھٹو کی ذات میں بہت سے نکات مشترک تھے اور دونوں کی سیاست میں کئی زاویے مختلف بھی تھے۔ لیکن امریکا اور پاکستان میں یہ فرق ہے کہ مارٹن لوتھر کنگ کی موت اس کمبرزگوں کے لیے مرگ یوسف ثابت ہوئی اور بھٹو کی موت پاکستان کے عوام کے لیے مرگ امید ٹھہری۔

www.bhutto.org

بھٹو کی پھانسی کا دن: آپ کی یادیں

ستائیس سال قبل پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو چار اپریل کی صبح پھانسی دے دی گئی۔ ان کی عمر اس وقت اکیاون برس تھی۔

پھانسی سے ایک دن قبل ان کی بیگم نصرت بھٹو اور بیٹی بے نظیر بھٹو نے ان سے ملاقات کی اور انھیں بتایا گیا کہ یہ ان کی ذوالفقار علی بھٹو سے آخری ملاقات ہے لیکن فوجی حکومت نے اس بات کی تردید کی کہ انھیں پھانسی دی جانے والی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھیں راولپنڈی ڈسٹرکٹ جیل میں صبح چھ بجے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ ان کی سزائے موت پر عمل درآمد کا اعلان دن کے گیارہ بجے ریڈیو پر کیا گیا اور ان کے خاندان کو ان کی آخری رسومات میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔

اسی بارے میں: ستائیس سال گزر گئے۔

اس دن پاکستان کی گلیوں میں ایک غیر معمولی ویرانی اور خاموشی طاری رہی اس دن کی اپنی یادیں یا اپنے والدین اور عزیز و اقارب کی یادیں جو لوگوں نے لکھیں جو اس کتاب میں شامل کی جارہی ہیں۔

آپ کی یادیں

احسان شیخ، ناروے: میں اس دن اپنے بھائی کو لاہور ریلوے اسٹیشن لے جارہا تھا۔ لگ بھگ صبح کے سات بجے تھے ایم سی روڈ پر ایک لڑکا بھٹو کی ''پھانسی'' پر ایک اردو ضمیمہ بیچ رہا تھا۔ میں دیکھ کر پریشان ہوگیا، اپنے بھائی سے گفتگو جاری نہیں رکھ سکا، میں بھٹو کا حامی نہیں تھا لیکن حکومت کی جانب سے اس کے ساتھ ایسا سفاکانہ رویہ.....

وقاص احمد، لاہور: میں جب بھی بھٹو کے بارے میں کچھ بھی پڑھتا ہوں یا سوچتا ہوں، میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ میں محبت پر یقین نہیں رکھتا تھا لیکن اب مجھے یقین ہے۔ میری عمر بائیس سال ہے، بھٹو کو میری پیدائش سے پہلے ہی پھانسی دے دی گئی تھی۔

افتخار رانا، دوبئی: بھٹو ایک عظیم رہنما تھے۔

مس سعیدہ اعوان، جاپان: اس دن سب لوگ رو رہے تھے اور مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کیوں رو رہے ہیں۔ پھر امی نے بتایا اور مجھے آج بھی یاد ہے کہ نانا اور ابو نے دس دن تک کھانا نہیں کھایا تھا۔

اختر: بھٹو واقعی ایک زبردست شخصیت کا مالک تھا۔ آج جب میں اقوام متحدہ کے اجلاس میں سے اس کے جرأتمندانہ موقف اور وہاں سے واک آؤٹ کرنے کا منظر ٹی وی پر دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ واقعی ہم نے ایک بہت بڑا لیڈر کھو دیا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بے نظیر میں اپنے والد کی کوئی خوبی نہ آسکی۔

شہباز جمال سردار، کراچی: مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن پورا ملک اداس تھا، خود ہمارے گھر میں بھی اداسی چھائی ہوئی تھی، میری بڑی بہن سیما جو اب اس دنیا میں نہیں ہے، اس دن کھانا نہیں کھا رہی تھی۔ پتا نہیں کہ بھٹو کی پھانسی جائز تھی یا نہیں، لیکن یہ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے۔

منزی، کینیڈا: اپنے کیریئر میں بھٹو نے غلطیاں کی اور سب سے بڑی غلطی تھی بنگلہ دیش۔ لیکن وہ واحد لیڈر تھے جن کے پاس سیاسی بصیرت تھی، جس کی وجہ سے وہ پاکستان اور پوری مسلم دنیا کی رہنمائی کر سکتے تھے۔

یاسر نقوی، کراچی: میں تو بہت چھوٹا تھا اور مجھے ہلکا یاد ہے کہ میری امی روئیں تھیں بہت۔ میں نے سنا بھی ہے اور دیکھا بھی ہے کہ بھٹو جیسا آدمی اب پاکستان کو نہیں مل سکتا۔

وقاص احمد، رحیم یار خان، پاکستان: میں اپنی رائے کیا دوں، کوئی بھی رائے کیا دے سکتا ہے۔ صرف اتنا کہوں گا کہ بھٹو واز دی بیسٹ۔ میں بھٹو سے پیار کرتا ہوں، وہ سب لوگ جو بھٹو کو غلط کہتے ہیں، وہ کچھ نہیں جانتے۔

امین، کینیڈا: شاہ فیصل اور بھٹو کے قتل مسلم دنیا کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئے۔

بلال عباسی، سعودی عرب: میرے خیال میں وہ دن پاکستان کی تاریخ کا سب

سے تاریک دن تھا جس دن عظیم بھٹو کو تختہ دار پر چڑھا دیا گیا میں بھٹو کے قتل کے لگ بھگ ایک سال بعد پیدا ہوا۔ جب میں اپنے دادا جان سے کوئی کہانی سنانے کو کہتا تو وہ رو رو کر بھٹو کی کہانی سناتے وہ اکثر کہتے کہ.....مجھ کو پھانسی دے دیتے لیکن بھٹو کا قتل نہیں ہوتا.....

محمد آصف لودھی، پاکستان: بھٹو جیسے آدمی صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

کبیر احمد، بلجیئم: اور تو کچھ یاد نہیں، البتہ اتنا یاد ہے کہ یہی وہ بھٹو تھے جس نے شملہ میں کشمیری قوم کا صدقہ کیا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس نے بھی کشمیر یا کشمیریوں کے ساتھ برا سلوک کیا اس کو بہت سخت سزا ملی.....

جاپانی، سپیشل: ایک مجرم کو پھانسی ہی ملا کرتی ہے اور یہ انصاف کے لیے ضروری ہے.....ورنہ ہر پھانسی پانے والے کی کہانی دردناک ہوتی ہے۔ ہمارے میڈیا کے لوگ اور ادارے اگر صحیح کردار ادا کریں اور گڑھے مردے نہ اکھاڑیں تو کچھ بہتری پیدا ہو سکتی ہے لیکن مجھے پتا ہے کہ میری رائے ویب سائٹ پر نہیں چھاپی جائے گی۔

عمر فاروق، برمنگھم: میرے خیال میں وہ سب غلط، ناجائز اور غیر انسانی ہوا کیوں کہ اس کام کے پیچھے ''بہادر اور مقدس گائے'' یعنی ہماری فوج تھی۔

سید حق، ٹیکساس: مجھے بس یہ یاد ہے کہ اس روز ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا گیا تھا اور ایک نوجوان ہوا میں ضمیمے کی کاپی لہراتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ ''بھٹو کو پھانسی دے دی گئی.....''

طاہر سلیم، پاکستان: میں ان دنوں چھوٹا سا بچہ تھا جو اچھے برے میں زیادہ تمیز نہیں کر سکتا لیکن نہ جانے کیوں مجھے بھٹو صاحب سے لو ہو گیا تھا اور اس راز کو میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ میرے خیال میں یہ ہمارے ملک کا سب سے بڑا نقصان تھا کہ ہم نے اتنا بڑا لیڈر کھو دیا اور ہماری قوم آج تک اس کی سزا بھگت رہی ہے۔

صفدر ندیم، جرمنی: موت کا ایک دن مقرر ہے مگر ایسی اور ایسے انسان کی موت کبھی نہیں بھلائی جا سکتی۔ بھٹو صاحب جیسے انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کی کمی بھی صدیوں رہتی ہے۔ ہمارے ملک کو آج بھٹو صاحب جیسے انسان کی ضرورت تھی مگر افسوس کہ ایک انسان کی ضد کی وجہ سے ہم نے اپنا اور اپنے ملک کا نقصان کیا۔

فواد فراز، نیو جرسی: بلا شبہ بھٹو نے ملک کے لیے بہت کچھ کیا مگر جتنا اچھا کیا اس سے کہیں زیادہ برا بھی کیا۔ ان کی ضد اور حکومت کرنے کے لالچ نے پاکستان کے دو ٹکڑے

کر دیے۔ ہزاروں مہاجرین آج بھی محصورین کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر وہ آج بھی زندہ ہوتے تو ملک کے دو یا تین ٹکڑے اور ہو جاتے۔

ساجھ پالیجو، ٹھٹھہ: ''جب پرچم جاں لے کر نکلے ہم خاک نشیں مقتل مقتل'' اس وقت سے لے کر آج تک جلاد پہ ہیبت طاری ہے۔

شاہدہ اکرام، ابوظہبی: اتنے سال گزر گئے اور لگتا ہے کہ کل کی بات ہے۔ ابو نے صبح صبح بی بی سی کی خبریں لگائی تھیں جن کا ایک ایک لفظ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ بھٹو صاحب کی پھانسی کے کاغذات ابھی تک ضیاء الحق کی میز پر ہیں اور ان پر ابھی تک دستخط نہیں ہوئے۔ ضیاء صاحب ابھی تک اس پر غور کر رہے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے کیا سوچا ہے اور اس وقت تک بھٹو صاحب کو پھانسی ہو چکی تھی۔ ہماری صبح بی بی سی کے میوزک اور ابو کی آواز سے وہا کرتی تھی۔ وہ وقت یاد کرتے ہوئے بہت کچھ یاد آ رہا ہے اور کی بورڈ دھندلا رہا ہے۔ لیکن آپ نے بھی تو یادیں ہی لکھنے کو کہا ہے ناں۔ جب بی بی سی جتنا مضبوط ادارہ کچھ نہ سمجھ سکا تو ہم سب بھی مطمئن ہو گئے کہ کچھ نہیں ہوا لیکن جب گیارہ بجے کی خبروں میں نیوز ریڈر نے ایک ہی سانس میں پوری خبر سنا دی اس آخری جملے کے ساتھ کہ ان کو دفنا بھی دیا گیا ہے تو بے اختیار سب کی چیخیں نکل گئیں۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آج بھی گھوم رہا ہے۔ ہم سب رو رہے تھے اور میری بہن جو اسی وقت سکول سے آئی تھی، دروازے کے ساتھ کھڑی بری طرح رو رہی تھی۔ گلیاں اور بازار اتنی تیزی سے سنسان ہوئے کہ جیسے یہاں کبھی کوئی تھا ہی نہیں۔ کچھ دن پہلے ہی ہمارے پیارے ماموں جان کی وفات ہوئی تھی اور ہمارے گھر میں بہت لوگ آ جا رہے تھے، امی کہا کرتی تھیں کہ میں نے اس سے پہلے خواب میں اپنے دو دانت ٹوٹتے دیکھے تھے، بھائی جان تو چلے گئے، اللہ رحم کرے دوسرا دانت کیوں ٹوٹا؟ بھٹو کی پھانسی پر وہ بے اختیار کہتیں، دیکھا میں کہتی تھی ناں، بھٹو بھی میرے بھائی ہی تھے۔ ہو سکتا ہے آپ کو یہ باتیں جذباتی لگیں لیکن وہ لمحات ہی کچھ ایسے تھے۔ بعد میں مجھے میرے شوہر نے بتایا کہ بھٹو کی ذاتی چیزیں لاڑکانہ لے جانے والے سی ون تھرٹی میں وہ بھی شامل تھے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ وقت گزر گیا۔

صالح محمد، راولپنڈی: یہ صحیح بات ہے کہ پیپلز پارٹی واحد جماعت ہے جس کے لوگوں نے نہ صرف اس وقت خود سوزی کی بلکہ آج بھی یہ ہو چکا ہے۔ بھٹو ایک عظیم رہنما

تھے اور ہم نے ان کو بھی پھانسی پر لٹکا دیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ پاکستان ابھی تک غیر ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا ہے۔

نیک محمد بھنگر، نواب شاہ: بھٹو ایک عظیم رہنما تھے جنھیں پاکستانی حکومت نے بغیر کسی وجہ کے پھانسی پر چڑھا دیا۔ آج ہم سب یہ جانتے ہیں اور اس ملک میں رہتے ہوئے عدم تحفظ کا شکار محسوس کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہمیں نہیں معلوم کب ہمیں بغیر کسی وجہ کے مار دیا جائے۔ یہ ملک عراق سے کم نہیں اور حکام صدام اور اسامہ سے کم نہیں۔

فیروز برہان پوری، کراچی: میں اس دن دوہا، قطر میں تھا جب میں نے صبح بی بی سی پر شاید جیلانی یا علی احمد خان صاحب کی آواز میں سنا کہ اس وقت راولپنڈی میں صبح ہو کا عالم ہے، سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر ہے، چار فوجی ٹرک جیل سے نکل کر شاید فوجی ایئر بیس کی جانب جا رہے ہیں اور وہ تفصیل دی جو بی بی سی کا طرہ امتیاز ہے۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا اور بستر پر لیٹ کر سوچنے لگا کہ وہ طمطراق، کرسی پر گھونسے مار کر یہ کہنا کہ یہ بڑی مضبوط ہے، جلسوں میں اس کا انداز تخاطب اور معاملہ فہمی، شیطانی مسکراہٹ اور ہٹ دھرمی جس کی تصدیق خوشونت سنگھ نے بھی ''زلفی میرا یار'' اور اوریانہ فلاچی نے بھی کی، سب کیا ہوئے۔ بھٹو کی پھانسی پر لوگ سمجھتے تھے کہ ایک طوفان آ جائے گا لیکن ایک پٹاخہ بھی نہ پھوٹا اور اسکی کابینہ کے ایک وزیر نے اس دن اپنی شادی رچائی۔ میری ماں جو پورے گھر سے ناراض ہو کر ستتر کے انتخابات میں اسے ووٹ دے کر آئی تھی، اس دن بہت روئی۔ آج وہ بھی کہتی ہے کہ بھٹو نے ملک کو دو ٹکڑے کر دیا۔ اس دن تارا مسیح نے اس کو پھانسی دے کر تین ہیروں والی انگوٹھی اور دستی گھڑی زینتھ اتار لی اور وہ کچھ نہ کر سکا، ان کے لیے درسِ عبرت تھا جو یہ سمجھتے تھے کہ کوئی ان کا کچھ نہیں کر سکتا۔

یوسف خان، منگورہ: وہ دن میرے لیے باپ کی موت سے کم نہیں تھا۔ میں کالج میں ایف ایس سی کا طالب علم تھا اور میرا پختون سٹوڈنٹ فیڈریشن سے تعلق تھا۔ چار اپریل کو میں پشاور سے موٹر سائیکل کی بیٹری خریدنے گیا ہوا تھا میں رات ہوٹل میں گزار رہا تھا کہ اچانک میری آنکھ اس آواز پر کھل گئی کہ بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ میں فوراً اپنے کمرے سے باہر نکلا اور فوراً اخبار فروش سے وہ چھوٹا سا ٹکڑا پانچ روپے میں خریدا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بھٹو کو پھانسی بھی ہو سکتی ہے۔ غم سے نڈھال میں کمرے کی طرف گیا اور دوست کو

www.bhutto.org

اخبار دکھایا۔ ہم دونوں ہوٹل سے باہر نکلے تو بازاروں پر خاموشی طاری تھی۔ لگتا تھا جیسے ہر گھر میں کوئی مر گیا ہو۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اب میں پیپلز پارٹی میں شامل ہوں گا۔ میں نے پختون کو خیر آباد کہا اور پیپلز سٹوڈنٹ فیڈریشن میں شامل ہو گیا۔ ضیاء الحق کے بعد جب بے نظیر کی حکومت آئی تو میں بہت خوش تھا لیکن جلد ہی سیاست سے جی بھر گیا اور میں نے اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ اب میں ووٹ دینا بھی گناہ سمجھتا ہوں لیکن بھٹو کی شخصیت اور چار اپریل کا وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتا۔

غالب بریالائی، پشاور: بھٹو کی موت ایک عدالتی قتل اور پاکستان کے عدالتی نظام کے منہ پر ایک طمانچہ تھا۔

پرویز احمد میمن، رانی پور: ہمارا ان دنوں جناح ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی میں گھر تھا اور میرے پڑوس میں سید پرویز علی شاہ رہتے تھے جو اس وقت پی پی پی کے سرکردہ کارکن تھے۔ ہماری اکثر ملاقات ہوتی اور فرصت کے اوقات شطرنج کی بازی بھی سجا لیتے۔ بھٹو صاحب کی بہت سی باتیں وہ سنایا کرتے۔ غالباً شاہ صاحب ان دنوں روپوش تھے اور بھٹو صاحب کی گرفتاری کے بعد انھوں نے گرفتار ہو کر پانچ سال تک جیل بھی کاٹی۔ ان کی بھٹو صاحب کو قریب سے دیکھنے کی باتیں اور بھٹو کے قصوں نے میری بھٹو سے محبت میں بہت اضافہ کر دیا۔ میری عمر اس وقت ندرہ سولہ برس تھی اور میں خدا سے روزانہ بھٹو کے لیے دعا کیا کرتا۔ پھر ایک دن شاہ صاحب کے بیٹے نے آ کر مجھے نیند سے جگایا کہ پاپا نے یہ اخبار بھیجا ہے اور فوجیوں نے بھٹو کو مار دیا ہے..... میں نے وہ اخبار روتے ہوئے پڑھا، میری کیا حالت ہوئی میں بیان نہیں کر سکتا۔ سارا دن کراچی میں ہوکا عالم رہا۔ میں اداس تھا لیکن میں نے کراچی کا ہر شخص اداس اور غمگین دیکھا۔ مجھے بی بی سی کی شام کی اردو سروس کا انتظار تھا۔ ان دنوں کراچی میں گھر میں بی بی سی کی خبریں ریڈیو سے صاف سنائی نہیں دیتی تھیں۔ ہم دوست اور میرے بھائی گاڑی میں ہل پارک پر گئے اور اوپر پہاڑی پر خبریں سنیں۔ بی بی سی نے شاید اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ان کے قتل کے سوگ میں سیربین سے میوزک نہیں سنایا۔ میں خود کو بھلا سکتا ہوں لیکن وہ دن اور گھڑیاں کبھی نہیں بھلا سکتا۔

وہاب سومرو، لاڑکانہ: مجھے لگا تھا جیسے آج پاکستان ختم ہو گیا ہے۔

رابعہ ارشد، ناروے: میں بہت کچھ وقت کے ساتھ ساتھ بھول جاتی ہوں لیکن وہ دن

www.bhutto.org

میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں بہت چھوٹی تھی مگر میری نانی نے تین دن کھانا نہیں کھایا تھا اور بہ تروئیں۔ میں سمجھی تھی کہ خاندان میں کسی کی وفات ہوگئی ہے اور ہم بھی نانی کے ساتھ خوب روئے۔

منیر، اوسلو: آتی ہے کہیں دور سے آواز دما دم۔

محمود شیخ، سویڈن: سب کو معلوم تھا کہ عظیم بھٹو کو پھانسی دی جانے والی ہے مجھ کو ایسا لگا کہ انسانیت کے متعلق میرے تمام احساسات کچل دیے گئے ہیں۔ میں نے اپنے والد کی وفات پر بھی ایسا محسوس نہیں کیا تھا میرے لیے سانس لینا بھی مشکل تھا کہ ہم نے اپنے ملک کو تباہ کر دیا ہے۔ خدا ہمیں اور ہماری احسان فراموش قوم کو معاف کر دے۔

طاہر خان، ٹیکساس: انھیں پھانسی نہیں دی گئی تھی بلکہ بریگیڈیئر امتیاز نے قتل کیا۔ اس نے ککس مار کر ان کی پسلیاں توڑ دی تھیں۔ ضیاء الحق ان کے قاتل تھے۔ میرے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ ان کی قبر میں چونا ڈالا گیا تھا۔

کاشف علی رضا، راولپنڈی: وہ ایک قومی سانحہ تھا اور ہمیں ابھی تک ان جیسی سمجھ بوجھ والا رہنما نہیں مل سکا۔ میں جب اپنی قوم کے ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو ہم نے قائداعظمؒ سے لے کر بھٹو تک اپنے رہنماؤں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اس کی وجہ سے ابھی تک عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ ہماری قوم اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرے۔

محمد نوید، کراچی: بھٹو اور شاہ فیصل دونوں بہت عظیم رہنما تھے جنھیں مسلمان کبھی نہیں بھول سکتے۔ ہماری حکومت نے انھیں مار کر بہت ظلم کیا۔

علی نقوی، اوٹاوہ، کینیڈا: میں لاہور میں تھا اور بہت کم عمر تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک ضمیمہ دیکھا تھا جس پر لکھا تھا کہ بھٹو کو پھانسی چڑھا دیا گیا ہے۔ سب ضیاء الحق کو گالیاں دے رہے تھے اور اداس اور مایوس تھے۔ سب کا خیال تھا کہ ضیاء الحق نے انھیں ذاتی دشمنی کی بنا پر قتل کیا تھا۔

جنید ملک، جرمنی: وہ چار اپریل کا دن تھا اور میں ابھی کالج کا طالب علم ہوتا تھا۔ گیارہ بجے کی خبریں میں نے کسی ہوٹل کے چلاتے ہوئے سپیکر پر سنیں اور میرے اردگرد سناٹا چھا گیا۔ مجھے لگا میں نے کچھ کھو دیا ہے، مجھ سے کچھ چھین لیا گیا ہے، میری امیدیں، میرے عزم اور نہ جانے کیا کچھ۔ اس دن سے میں ہمیشہ کے لیے ناامید ہوگیا۔ میں نے پاکستان کو خیرآباد کہہ دیا لگتا تھا ہم نے پاکستانی عوام کی کھال کو نوچ دیا ہے۔ کوئی اتنا سفاد بھی ہوا کرتا ہے؟

❀

www.bhutto.org

سائیں بابا کا مزار

بابر علی ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے پندرہ برس بعد گڑھی خدا بخش میں پیدا ہوا۔ اس نے اپنے گھر کے باہر کچی منڈیر پر کرکٹ کے بلے کے زور پر کھڑے کھڑے یہ داستان سنائی۔

ذوالفقار علی بھٹو بادشاہ تھا اس لیے وہ یہاں رہتا تھا۔ ضیالو (ضیاء الحق) بھٹو صاحب کا ورک تھا۔ ایک دن بھٹو صاحب دورے پر گیا تو اس نے ضیالو کو اپنے تخت پر بٹھا دیا۔ جب بھٹو صاحب واپس آیا تو اس نے ضیالو سے کہا کہ تم اترو۔ ضیالو نے کہا کہ میں نہیں اتروں گا۔ اس لیے جھگڑا ہوا تخت پر اور بھٹو صاحب کو پھانسی آ گئی۔ اس کے بعد ضیالو نے کہا کہ بھٹو صاحب کو کفن نہیں پہنانا ہے۔ پھر یہاں بہت سی پولیس اور فوج آ گئی اور بھٹو صاحب کو ان کے قبرستان میں پور دیا گیا۔ یہ سب میں نے ٹی وی پر دیکھا ہے۔ میں نے گیارہ سالہ بابر علی سے پوچھا کہ تمہیں یہ کہانی کس نے سنائی۔ کہنے لگا میں نے ٹی وی پر بس اتنا ہی دیکھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا تم بھی بھٹو ہو کہنے لگا میری قوم تو قنبر ہے۔ اس کے بعد بابر علی بیٹ گھماتا ہوا ان بچوں میں شامل ہو گیا جو بہت دوری سے اسے اشارے کر رہے تھے۔

بابر علی کے گھر سے کوئی پچاس گز کے فاصلے پر میر اختیار خان کی پرانی سی حویلی ہے۔ میر اختیار خان کی عمر ستر برس کی لگ بھگ ہے اور رشتے میں وہ ذوالفقار علی بھٹو کے بھتیجے ہیں۔ وہ اسی حویلی میں رہتے ہیں جس میں کبھی ذوالفقار علی بھٹو کے دادا میر مرتضیٰ خان رہتے تھے۔

گڑھی خدا بخش میں اکیلے رہ جانے والے میر اختیار خان بھٹو چار اپریل انیس سو انہتر کے دن فوج کے پہرے میں لائی جانے والی بھٹو صاحب کی لاش کو تابوت سے نکالنے والے تین افراد میں شامل تھے۔ لاش کو چارپائی پر ڈال کر حویلی میں لایا گیا جہاں فوج نے بھٹو خاندان کی قریبی خواتین کے علاوہ گاؤں کے کسی فرد کو اندر جانے کی اجازت

نہیں دی۔ ہر طرف خاردار تاریں لگادی گئی تھیں اور بار بار زور دیا جارہا تھا کہ لاش کو جلد از جلد دفنا دیا جائے۔ اس وقت کے ڈپٹی کمشنر لاڑکانہ شاہد عزیز صدیقی کسی طرح فوجیوں کو سمجھانے میں کامیاب ہوگئے کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ اس یقین دہانی کے بعد فوجیوں نے بھٹو خاندان کے آدمیوں کو نجی طور پر تجہیز و تکفین کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد بھی گاؤں میں کئی ہفتے تک فوج اور پولیس کا پہرہ لگا رہا۔ کسی کو بھی کئی روز تک صبح دس بجے کے بعد کھیتوں میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

میر اختیار خان بھٹو نے بتایا کہ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کے دو تین برس کے اندر یہ گاؤں بھٹو برادری سے خالی ہوگیا۔ کوئی لاڑکانہ شفٹ ہوگیا تو کوئی کراچی۔ میرے بیٹے نے بھی مجھ سے کہا کہ اب یہاں کیا رکھا ہے۔ لیکن میں اس شرم میں یہاں سے نہیں ہلتا کہ دنیا کیا کہے گی۔ کیا گڑھی خدا بخش اس لیے ہے کہ یہاں بھٹو خاندان کا ہر آدمی تدفین کے وقت ہی لایا جائے اور پھر میں خود کو ان کی املاک کا امانت دار بھی سمجھتا ہوں۔ جب دفن یہیں ہونا ہے تو پھر یہاں سے کہیں اور کیا جانا۔

گڑھی خدا بخش کی آبادی ڈھائی تین ہزار کے لگ بھگ ہے۔ پانچ سو کے قریب کچے پکے گھر ہیں۔ گاؤں کے تقریباً وسط میں سیم کے پانی سے بنا ہوا ایک بڑا سا جوہڑ ہے۔ جس کے آس پاس کے کھلے علاقے میں بچے کھیلتے رہتے ہیں۔

میں نے اختیار خان سے پوچھا کہ ذوالفقار علی بھٹو نے اس گاؤں کے لیے کیا کیا۔ کچھ نہیں کیا، ڈرینج اور سیوریج کا نظام، سکول، ہسپتال سب بے نظیر کے دور میں بنا۔ جب کبھی بھٹو صاحب ہمارے گھر آتے تھے تو ہم اس سے مذاق مذاق میں پوچھتے کہ تم نے تو سارے ملک کا ٹھیکہ لے لیا ہے۔ یہاں کا ٹھیکہ کب اٹھاؤ گے۔ اس کا جواب ہوتا کہ ابھی میرے پاس ٹائم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دوسرے علاقوں کی ترقی شروع ہو جائے پھر یہاں بھی بہت کچھ ہو جائے گا۔ ورنہ دنیا کہے گی کہ یہ بھی دوسروں جیسا ہے۔ ہم اس کی یہ بات سن کر چپ ہو جاتے لیکن آپ کو بھی پتا ہے کہ اسے کتنا وقت مل سکا۔

شیخ غلام نبی چوبیس برس سے سبز چوغہ پہنے یہاں کی جھاڑو لگا رہا ہے۔ اس کے چوغے پر جیئے بھٹو سفید رنگ کی کڑاہی سے لکھا ہوا ہے۔ سائیں یہ لال رنگ کی چادر بابا سائیں کے لیے قلندر شہباز کے روضے کا تحفہ ہے۔ یہ کہتے ہیں غلام نبی قبر سے چادر پلٹ دی۔

www.bhutto.org

In loving memory of Quaid-e-Awam Zulfiqar Ali Bhutto, son of Sir Shahnawaz Khan Bhutto, President and Prime Minister Islamic Republic of Pakistan, born January 5th 1928, Martyered April 4th 1979.

A poet and a revolutionary.

لمبے چوڑے زیر تعمیر ہال میں یہ تحریر سنگ مرمر کی جس قبر پر کندہ ہے۔ اس کے سرہانے ایک نوجوان رحل پر قرآن پاک کھولے سورہ رحمان کی باآواز تلاوت کر رہا ہے۔

اس قبر کو ذوالفقار علی بھٹو کے دادا میر مرتضیٰ خان، والد سر شاہنواز خان، والدہ خورشید بیگم، اہلیہ امیر بیگم اور بیٹے میر مرتضیٰ اور شاہنواز کی قبروں نے گھیرا ہوا ہے۔

غلام نبی جاروب کش نے بتایا کہ جب بے نظیر پہلی دفعہ وزیراعظم بنیں اور بابا سائیں کے مزار کا کمپلیکس بنانے کا سوچا تو مسئلہ یہ تھا کہ اس قبرستان کے اردگرد جو گھر ہیں ان کا کیا کیا جائے۔ چنانچہ کوئی سو گھروں کے کنبوں کو ساری سہولتیں دے کر ایک نئی کالونی میں بسایا گیا جس میں میرا گھر بھی شامل ہے اور اب اس کمپلیکس کا رقبہ کوئی بیس ایکڑ کے لگ بھگ ہے تاکہ برسی کے دن آنے والوں کو تنگی نہ ہو۔

منٹھار علی کو دو برس پہلے ایک دن جانے کیا سوجھی کہ جامشورو یونیورسٹی کی ملازمت چھوڑ کر ذوالفقار علی بھٹو کے مزار کے صدر دروازے پر بیٹھ گیا اور پھول اور چادریں بیچنا شروع کر دیں۔ اس نے بتایا کہ برسی کے علاوہ بھی روزانہ کوئی نہ کوئی گروپ پنجاب اور سندھ کے مختلف علاقوں سے آتا رہتا ہے۔ کئی لوگ نرینہ اولاد کی دعا مانگنے کے لیے بھی حاضری بھرتے ہیں اور منت پوری ہونے پر دیگیں اور بکرے لے آتے ہیں۔ شادی شدہ جوڑے بھی آتے ہیں اور جن لڑکے لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی وہ بھی سائیں بابا کی حاضری میں آتے ہیں۔ میں نے منٹھار علی سے کہا کہ تم نے اک اچھے بھلے سوٹ ٹائی والے سیاستدان کو بعد از مرگ پیر کا چوغہ پہنا دیا۔

سائیں ایسا نہ کہیں۔ گناہ مت کمائیں۔ ابھی مجھے بتائیں کہ ضیاء الحق کی قبر پر بھی کیا کوئی منٹھار علی بیٹھا ہے کیا وہاں بھی لوگ پھول لے کر اولاد اور شادی کی منت ماننے جاتے ہیں۔ آپ کیسی بات کرتے ہو.....

www.bhutto.org